جلد ۱
شمارہ ۱

تشکیک پر ضرب یقین

الاصول

جمادی الأول، جمادی الآخر 1445/ نومبر، دسمبر 2023

تشکیک پر ضرب یقین

الاصول

جلد ۱ ماہ جمادی الاول، جمادی الآخر ۱۴۴۵ / نومبر، دسمبر ۲۰۲۳ شمارہ ۱

فہرست مضامین

شذرات	مدیر	2
قرآن وحدیث مقدم ہیں یا اسلاف کا فہم اسلام؟	زاہد صدیق مغل	5
اسلام میں عقیدے کا مفہوم اور اس کے مآخذ۔	مدیر	8
جدیدیت: تعارف، تاریخ اور اس کے اثرات	محمد حذیفہ نوری	14
قوموں کے زوال کا اُن کی نوجوان نسل پر اثر	جرنوہندی	21
انسان کی ترقی کیا ہے؟	مولانا عاشق الٰہی بلند شہری	37
مابعد جدیدیت: کیا انارکی ہے؟	احمد جاوید	44

مدیر: عاصم افتخار

مجلس ادارت

مزمل الرحمن قاسمی
عبداللہ منہاج
محمد عمیر ندوی

مجلس مشاورت

یاسر ندیم الواجدی
عثمان بیگ حسامی
خورشید عالم داؤد قاسمی
عبدالمعز حسامی
محمد مجیب الرحمٰن

شذرات

جنگ عظیم دوم کے بعد دنیا کی بڑی طاقتوں نے اس فکر اور بیانیے کو عام کرنے اور مقبول بنانے پر پوری سیاسی اور تعلیمی قوت صرف کر دی کہ اب دنیا استعماریت سے آزاد ہو چکی ہے اور ہم ما بعد استعماریت کے دور میں داخل ہو چکے ہیں؛ لیکن اگر گہرائی سے سیاسی معاشی سماجی اور تعلیمی حالات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بیانیہ بس ایک دجل ثابت ہوتا ہے۔

دنیا کے اکثر ممالک آج بھی سیاسی فیصلے استعماری قوتوں کی پالیسی کے مطابق لیتے ہیں، کوئی بھی ایسا سیاسی فیصلہ جو استعماری قوتوں کو چیلنج کرے یا ان کے نفع کو ٹھیس پہنچائے تو وہ استعماری طاقتوں کو قبول نہیں ہوتا۔

اولاً تو اکثر ممالک اس کی استعداد ہی نہیں رکھتے کہ وہ کوئی بھی ایسا فیصلہ لیں جو استعماری قوتوں کی پالیس سے ہم اہنگ نہ ہو اور اگر کبھی کوئی جرأت مند حکمران یہ ہمت کر بھی لے تو اسے زیر کرنے کے لیے معاشی پابندیوں کا ہتھکنڈا اپنایا جاتا ہے اور اگر معاشی پابندیوں سے بھی زیر نہ ہو تو توپ کے دہانے اس وقت تک کے لیے کھول دیے جاتے ہیں جب تک کہ اس حکومت کی آخری عمارت بھی زمین بوس نہ ہو جائے۔ جیسا کہ پچھلے 20 سالوں میں افغانستان عراق لیبیا اور مصر اس کا زندہ ثبوت ہے۔

سیاسی فیصلوں کے بعد اگر ہم معاشی سماجی اور تعلیمی میدان کا جائزہ لیں تو حالات مزید سنگین ہیں ان میدان میں ریاستوں اور قوموں کی خود مختاری نہ کے برابر ہے مارکیٹ میں سرمایہ دارانہ نظام کی اجارہ داری ہے اور تمام دنیا بشمول مسلم ممالک کے سرمایہ دارانہ نظام کی نہ صرف غلام ہے؛ بلکہ اس کو چلانے اور باقی رکھنے میں تیل کا کام کر رہی ہے۔ سماجی قدروں کا جائزہ لیں تو ہماری اکثریت مغربی انسانی حقوق کو ایک مقدس قدر مان کر اس کی حفاظت کے لیے لہو کا آخری قطرہ بھی صرف کرنے کو تیار ہے۔

سب سے سنگین حالات تعلیمی میدان میں ہے کہ مسلم معاشرہ مغربی تصور علم کو حتمی سچائی مان چکا ہے اور ان سے ادھار لیے ہوئے تصور علم پر اسلامی اسکولوں کی فیکٹریاں تعمیر کی جا چکی ہے، جو مسلم معاشرے میں مادی فکر اور رجحان کو پیدا کرنے، پروان چڑھانے یہاں تک کہ اسے عین اسلام ثابت کرنے میں قائدانہ کردار ادا کر رہی ہے۔

موجودہ نظام کے اس مختصر تجزیے کے بعد اگر ہم مسئلۂ فلسطین کو دیکھیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ استعماریت کا ایک ایسا حقیقی جسمانی تسلسل ہے جس کی آزادی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم ذہنی استعماریت سے آزاد نہ ہوں۔ غزہ پر موجودہ حملوں نے استعماری طاقتوں کا دوغلاپن گرچہ ظاہر کر دیا ہے؛ لیکن اس کے اثرات وقتی ہیں کہ اس دوغلے پن کے ظاہر ہو جانے کے بعد

بھی مسلم معاشرہ ان ہی دوغلوں کے بنائے ہوئے انسانی حقوق کے معیار کے مطابق انصاف کا طلب گار ہے۔

استعماری قوتیں ہمیشہ سے اپنے ظلم کا ایک جواز پیش کرتی رہی ہیں اور غزہ میں بھی ظلم کا جواز پیش کیا جا رہا ہے، اگرچہ ان کا ظلم اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ چھپائے نہیں چھپ رہا؛ لیکن یہ بھی دھیان رکھنے کی بات ہے کہ دنیا کے زیادہ تر میڈیا ہاؤسز سوشل میڈیا کمپنی اور انفارمیشن کے دوسرے ذرائع سب ان ہی استعماری طاقتوں کے کنڑول میں ہے یہی وجہ ہے کہ مین اسٹریم میڈیا فلسطین کے اصل بیانیے کو دبا کر اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بیانیہ کے طور پر پیش کر رہا ہے اور اپنے ظلم کو جائز ٹھہرا رہا ہے، قابل غور بات یہ ہے کہ جو بھی ان کے بیانیے کو چیلنج کرتا ہے اسے بھی وہ دہشت گرد یا دہشت گرد کا حامی بول کر چپ کرانے کی کوشش کرتے ہیں ایسے میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ فلسطین کے مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے فلسطین کے بیانیہ سے دنیا کو مضبوطی کے ساتھ ہمیشہ آگاہ کراتے رہیں کہ یہ دو برابر طاقتوں کی لڑائی نہیں؛ بلکہ ایک استعماری قوت کے خلاف نہتے لوگوں کی جدوجہد ہے۔

''قرآن و حدیث مقدم ہیں یا اسلاف کا فہم اسلام؟''

سوال درست کیجئے

زاہد صدیق مغل

جدید حضرات کا ایک عمومی وار یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ ان کے سامنے اسلاف کے فہم اسلام کی بات کریں گے تو جھٹ سے کہیں گے: ''**کیا اسلاف کا فہم مقدم ہے یا قرآن و حدیث؟**'' ۔یہ سوال کچھ یوں پوچھا جاتا ہے گویا تاریخی فہم اسلام اور قرآن و حدیث متضاد یا الگ چیزیں ہیں، نیز تاریخی اسلام رد کر دینے کے بعد یہ لوگ نیوٹرل مقام پر براجمان ہو کر قرآن و سنت کا مطالعہ کر کے نتیجے اخذ کر رہے ہیں، جب کہ یہ دونوں ہی مفروضے غلط ہیں۔ان حضرات کی چالاکی یہ ہے کہ اپنے فہم اسلام کو یہ بذات خود قرآن و سنت کے ہم معنی قرار دے رہے ہوتے ہیں۔چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہم قرآن و سنت سے دلیل لا رہے ہیں۔تو جناب کیا روایت پسند لوگ اپنے فہم دین کے لیے وید یا گیتا سے دلیل لاتے ہیں؟ ظاہر ہے ہر گروہ قرآن و سنت ہی کے ماخذ ہونے کا دعوی کرتا ہے اس میں ایسی نئی بات کیا ہے؟

در حقیقت ان لوگوں سے گفتگو کا بنیادی اور متعلقہ نکتہ یہ نہیں کہ ''آپ کے دین کا ماخذ کیا ہے؟'' ظاہر بات ہے کہ ہر گروہ یہی دعوی کرتا ہے کہ اس کا ماخذ قران و حدیث ہے؛ بلکہ یہ ہے کہ ''آپ کے ماخذات دین کے فہم کا راستہ و ماخذ کیا ہے؟'' یعنی آپ فہم دین کو کس اصول، روایت اور پیراڈائم سے اخذ کرتے ہیں؟ موجودہ دنیا میں اس کی دو غالب پیراڈائمز ہیں۔ تاریخ اسلام کے اندر متشکل پانے والا فہم اسلام (اس کا دعوی ہے کہ دین کی درست تشریح وہ ہے جو اسلامی تاریخ کے اندر وضع کی گئی ہے) حاضر و موجود جدید ڈسکورس کے اندر وضع کیا جانے والا فہم اسلام (اس کا دعوی ہے کہ درست تعبیر وہ ہے جو معروضی یعنی جدیدیت کے تاریخی تناظر کے اندر وضع کی جارہی ہے) مگر اس پیراڈائم کے قائلین ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اس پوزیشن کو بذات خود قران و سنت کہہ دیتے ہیں۔

ان دو کے علاوہ یہاں کوئی عمومی چوائس ہے۔ چنانچہ سوال یہ نہیں کہ قرآن و سنت کس کے پاس ہے ، اصل مسئلہ یہ ہے کہ 'قرآن و سنت کا پیش کیا جانے والا فہم' کس کا درست ہے؟ یعنی یہاں چوائس صرف پیراڈائیم کی ہے، نہ کہ قرآن و سنت کو ماننے یا نہ ماننے کی۔ لہذا ماڈرنسٹ جب یہ کہتے ہیں کہ ''اسلاف کا فہم مقدم ہے یا قرآن و حدیث؟'' تو اسکا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ''اسلاف کے فہم اسلام کو رد کردو؛ کیوں کہ وہ جدید تناظر میں قابل عمل نہیں، اور ہمارا فہم اسلام قبول کرلو کہ یہ جدید تناظر کے ساتھ ہم آہنگ

ہونے کی وجہ سے درست ہے۔'' درحقیقت ان دونوں کے دعووں کی نوعیت ایک سی ہے، دونوں کا ریفرنس پوائنٹ تاریخی تناظر سے مطابقت رکھتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ ماڈرنسٹ کا ریفرنس جدیدیت کی تاریخ کے مطابق ہوتا ہے، جب کہ روایت پسند کا اسلامی تاریخ کے ساتھ۔ مگر یہ ماڈرنسٹ بڑی چابک دستی کے ساتھ اپنے نظریات کو ''قرآن و سنت'' جب کہ تاریخ فہم اسلام کو ''اسلاف کا فہم'' قرار دے کر اپنے نظریات کے لیے بلاجواز تفاخرانہ جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پس اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اپنے نظریات کے جواز کے لیے یہ جدیدیت پسند جس سوال کو ''اسلاف کا فہم اسلام بمقابلہ قرآن وحدیث'' کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں در حقیقت اس گفتگو کا اصل عنوان ''اسلامی تاریخ کا فہم اسلام بمقابلہ جدید تاریخ کا فہم اسلام'' ہوتا ہے، مگر چند سادہ لوح روایت پسند لوگ انکی اس ''چکر بازی'' کو سمجھ نہیں پاتے اور نتیجتا گفتگو کے غلط عنوان کے تحت گفتگو کرتے کرتے ان سے مرعوبیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہوتا ہے کہ سوال کا جواب دینے سے قبل سوال کی درست نوعیت کو سامنے لایا جائے، بصورت دیگر غلط سوال کا جواب دینے کی کوشش میں ایک غلط جواب ہی سامنے آئے گا۔

اسلام میں عقیدے کا مفہوم اور اس کے مآخذ۔

عاصم افتخار

عقیدہ عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مادہ عقد ہے جس کے لغوی معنی گرہ لگانے کسی چیز کو مضبوطی سے باندھنے، عہد و پیمان کرنے، کسی چیز کو پختہ کرنے کے ہیں، جیسے قرآن میں ہے: "واحلل عقدة من لساني" (ترجمہ: اور میری زبان کی گرہ کھول دے) یا کہتے ہیں: "عقد الحبل" یعنی اس نے رسی کو مضبوطی سے باندھا یا "عقد اليمين" اس نے قسم پختہ کی۔ عقیدہ کا لغوی معنی ہوتا ہے گانٹھ یا مضبوط گرہ اور اصطلاح میں کسی بات یا نظریہ پر اس طرح یقین رکھنے کو کہتے ہیں کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ عقیدہ کی اصطلاح کی شروعات علم کے طور پر چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی؛ لیکن قرآن و سنت میں پہلے سے اس لفظ کا ثبوت موجود تھا۔

انسانی زندگی میں عقیدے کا کردار

کسی بھی انسان کی زندگی کا رخ طے کرنے میں انسان کے عقائد کا سب سے اہم کردار ہوتا ہے، عقیدہ محض ایک چیز کو جان لینا یا سماجی طور پر ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے والے خیالات کا نام نہیں ہے۔ عقیدہ اس سوچ اور فکر کا نام ہے جو کسی انسان کے جسم و جان میں سرایت کر جائے، اس کے جسم میں لہو بن کے دوڑے، اس کے ہر عمل کا

رخ اور دائرہ متعین کرے، اس کے لئے انسان ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے، دنیا کا کوئی بھی انسان بغیر عقیدے کے نہیں ہے، کوئی واحد خدا کا عقیدہ رکھتا ہے، تو کوئی اسی واحد خدا کے انکار کا عقیدہ رکھتا ہے، کوئی ایک سے زیادہ خداؤں کا عقیدہ رکھتا ہے، کوئی خدا کی برتری کا عقیدہ رکھتا ہے تو کوئی عقل کی برتری کا تو کوئی سماج کی برتری کا۔ غرض ہر کوئی کچھ نہ کچھ عقیدہ رکھتا ہے جو اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے کو محیط ہوتا ہے۔

عقیدہ کے اقسام

اسلام میں بنیادی طور پر عقائد کی دو قسمیں ہیں: اول وہ جس پر اسلام و کفر کا دار و مدار ہے جسے قطعی عقائد کہا جاتا ہے۔ جیسے اللہ کے اکیلے معبود ہونے، نبیوں پر اور آخرت وغیرہ پر ایمان لانے کا عقیدہ۔ دوم وہ جس پر اسلام و کفر کا مدار تو نہیں ہے؛ لیکن اس سے گمراہی اور فسق لازم آتا ہے، اسے ظنی عقیدہ کہتے ہیں۔ جیسے کہ حیات النبی کا عقیدہ یا حضرت ابو بکر کی فضیلت تمام انبیاء کے بعد وغیرہ۔ موجودہ دور میں عام مسلمانوں میں عقیدہ کی تیسری قسم بھی پائی جاتی ہے جو نہ قطعی ہے نہ ظنی؛ بلکہ انفرادی اور جزوی واقعات سے تعلق رکھتی ہے؛ لیکن اسے قطعی عقائد کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کے زیادہ تر عقاید کی بنیاد موجودہ دور کے کسی شیخ یا دانشور کے خیالات و اقوال ہوتے ہیں۔

قطعی عقائد کے ماخذ

قطعی عقائد ان عقائد کو کہتے ہیں جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ نص سے ثابت ہوں۔ قطعی الثبوت کے معنی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے لے کر ہم تک کسی نص کے پہونچنے کا ثبوت حتمی اور یقینی ہو، اس کے نص ہونے میں کسی قسم کا شبہہ یا اختلاف نہ ہو۔ جیسے قرآن کریم کی تمام آیتیں قطعی الثبوت ہیں اور احادیث متواترہ بھی ایک بڑے گروہ کے واسطہ نسل در نسل ہم تک منتقل ہوا ہے تو یہ بھی ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہیں، احادیث کا زیادہ تر ذخیرہ ظنی الثبوت ہے جو کفر اسلام کا مدار تو نہیں بن سکتے؛ لیکن اس سے اعمال کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ قطعی الدلالۃ سے مراد یہ ہے کہ کسی نص کے معنی و مراد متعین اور حتمی ہوں اور اس میں کسی اور معنی کا احتمال نہ ہو۔ قرآن کی چند آیات اور چند احادیث قطعی الدلالۃ نہیں ہیں کہ ان کے مفہوم میں ایک سے زائد معنی کا احتمال پایا جاتا ہے۔

بنیادی قطعی عقائد کون کون سے ہیں

اہل سنت والجماعت کے بنیادی قطعی عقائد وہ ہیں جو ایمان مفصل میں بیان ہوئے ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل، ایمان بالآخرۃ، ایمان بالقدر ہیں۔ یہ سب اپنے اجمال کے ساتھ ہی بنیادی و قطعی عقائد ہیں، ان عقائد کے ساتھ چند اور قطعی عقائد ہیں جیسے رسول اللہ کا ختم الرسل ہونا، پانچ وقت کی نماز کا فرض ہونا، مالدار پر زکوۃ و حج فرض ہونا، رمضان کے روزہ کا فرض ہونا، وغیرہ کے انکار سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے مگر اس کی وہ تفصیلات جو خبر واحد میں آئی ہے یا متقدمین علماء نے

اصول کی روشنی میں قرآن وحدیث سے ان کے متعلق جو مفہوم اخذ کئے ہیں وہ سب ظنی دلائل کے ضمن میں آتے ہیں جس کے انکار سے گمراہی لازم آتی ہے کفر نہیں۔

ظنی عقائد کے مآخذ

ظنی عقائد ان عقائد کو کہتے ہیں جو ظنی الثبوت یا ظنی الدلالۃ نص سے ثابت ہوں۔ ظنی الثبوت کے معنی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے لے کر ہم تک کسی نص کا ثبوت ظنی ہو یعنی بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ اسے نسل در نسل منتقل نہیں کیا؛ بلکہ چند لوگوں نے کیا ہو جیسے کہ تمام اخبار آحاد وغیرہ، ظنی الدلالۃ کے معنٰی یہ ہے کہ کسی نص کے معنی متعین و حتمی نہ ہوں بلکہ اس سے مختلف مفہوم اخذ کرنے کی گنجائش ہو۔ بعض وقت مختلف مفہوم میں سے امت کا ایک مفہوم پر اجماع ہو جاتا ہے تو پھر وہ معنی کے اعتبار سے قطعی الدلالۃ ہو جاتے ہیں جیسا کہ امام شاطبیؒ نے موافقات میں ذکر کیا ہے۔

ظنی عقائد اور متقدمین علماء

قطعی عقائد کی فہرست سازی تو ممکن ہے؛ لیکن ظنی عقائد کی فہرست سازی ممکن نہیں؛ کیوں کہ اس میں زمانے کے حالات اور انسانی فہم کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم متقدمین علماء کے منہج کا مطالعہ کریں تو یہ بات عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ متقدمین علماء عقائد میں تفصیلات کو پسند نہیں فرماتے تھے کیونکہ اس سے انتشار کا خدشہ رہتا ہے، یہ بدیہی ہے کہ جس میں جتنی تفصیلات ہو گی اس میں اختلاف بھی زیادہ ہونگے

مزید برآں کہ عقائد کا زیادہ تر تعلق ایمانیات وغیبیات سے ہے، جس میں انسانی فہم وشور کا کوئی دخل نہیں تو جہاں انسانی عقل وفہم کی نارسائی ہو وہاں سکوت ہی بہتر ہے۔ جیسا کہ امام مالک نے استواء عرش سے متعلق ایک سوال کے جواب فرمایا ''الاستواء معلوم والکیف مجھول والإیمان به واجب والسؤال عنه بدعة''یعنی استواء معلوم ہے۔ استواء کی کیفیت معلوم نہیں، استوا پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال پوچھنا بدعت ہے، اس کے آخری فقرہ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ عقائد میں اجمال مقصود ہے تفصیلات پسندیدہ نہیں، اور یہی روش متقدمین علماء کے یہاں ملتی ہے جیسے کہ امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب عقاید کی کتاب ایک کتابچہ ہے اسی طرح عقیدہ الطحاوی بھی ایک کتابچہ ہی ہے۔ بعد میں علم العقائد اور علم کلام میں جو تفصیلات ملتی ہیں اس کے تمام محرکات دفاعی اور خارجی رہے ہیں اس لئے ظنی عقائد کی بحث سے عام مسلمانوں کو احتراز کرنا چاہیے۔

عقائد جاننے کے لئے کونسی کتابیں پڑھنی چاہیے

عمومی طور پر اہل سنت والجماعت کے عقائد جاننے کے لئے سب سے آسان اور بنیادی کتاب عقیدہ الطحاوی ہے، اس کے کئی سارے اردو ترجمے بھی دستیاب ہیں، بازار سے خرید کر یا آنلائن ڈائون لوڈ کر کے پڑھے جاسکتے ہیں، اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (نور اللہ مرقدہ) کی عقیدۃ الحسنہ بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ مزید اگر چاہیں تو کسی بھی

عالم کی ایسی کتاب جو اجمال کے ساتھ عقاید بیان کرتے ہوں مطالعہ میں رکھی جاسکتی ہے۔

جدیدیت: تعارف، تاریخ اور اس کے اثرات

محمد حذیفہ نوری

متعلم شعبہ تخصص فی الحدیث دار العلوم دیوبند

انسان کی زندگی تکالیف و مصائب سے عبارت ہے، اس عالم فانی میں ہر آن و ہر لمحہ کسی نہ کسی عوارض و حادثات کے سبب ابن آدم پریشانیوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے، ایسے وقت میں جو چیزیں زیست میں اس کے لیے سکون و عافیت کا باعث بنتی ہیں، وہ اس دو جہاں کے خالق سے تعلق، اس کی عبادت اور اس کی طرف سے اطمینان قلبی والی کیفیت ہے، گویا مذہب، انسان کے لیے ایک نعمت ہے، ایک سہارا ہے، اس کے درد کا درماں ہے، اور ساتھ ہی اخروی زندگی کے لیے نجات کا باعث ہے؛ لیکن زمانہ بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے، روز بروز نت نئے ایجادات عقلوں کو خیرہ کر رہے ہیں، صنعتی انقلابات کے باعث انسان کے طور طریقے بدلتے چلے جا رہے ہیں، ایک انسان جو پہلے اپنے خالق کا محتاج تھا، جو ہر گھڑی اپنے معبود کی پرستش کیا کرتا تھا، آج وہی انسان زمانے کے انقلابات کے پیش نظر زندگی کے مختلف گوشوں میں مذہب سے لاتعلقی، بیزاری اور اپنے خالق سے بے نیازی کا مدعی بن چکا ہے، درحقیقت یہی جدیدیت ہے، اور آج کا دور

جدیدیت (Modernism)کا دور ہے، بلکہ اب یہ دور ارتقاء کے مراحل طے کر کے مابعد جدیدیت (Post Morderinsm) کا دور ہو چکا ہے

جدیدیت کیا ہے؟اس کی تاریخ کیا ہے؟اور اس کے اسباب و عوامل نیز انسانی سماج میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ یہ چند سوالات ہیں جن کے جوابات ذیل میں پیش کئے جائیں گے۔ان شاءاللہ

جدیدیت یہ جدید سے ماخوذ ہے، جو قدیم کی ضد ہے، قدامت یا جدت یہ امور اضافیہ میں سے ہے، یعنی جدت کے لیے قدامت کا ہونا ضروری ہے، کسی چیز کو جدید اسی وقت کہا جائے گا جب وہ کسی زمانے میں قدیم بھی رہا ہو، بعینہ جدیدیت کا دور بھی ایسا ہی ہے۔پہلے لوگ روایت پسند ہوا کرتے تھے، مذہب کا تصور ان کے لیے نہایت اہمیت کا حامل تھا اور زندگی کے مختلف گوشوں پر عمل کرنے کے لیے اپنے اسلاف کے تابع ہوتے تھے؛ لیکن اب انقلابات زمانہ کے پیش نظر جدیدیت کا راگ الاپتے ہوئے آزاد ہو گئے اور اسلاف کی روایات کو کلیۃً ترک کر دیا، پھر یہ دور جدیدیت کا دور کہلایا جانے لگا، اور ماہرین عمرانیات نے جدیدیت کو ایک اصطلاح کے طور پر متعارف کرایا اور انھوں نے جدیدیت کی اصطلاحی تعریف اس انداز سے پیش کی۔

جدیدیت کی تعریف :

"The enlightenment-humanist rejection of tradition and authority in favour of reason and natural science. This is founded upon the assumption of the autonomous individual as the sole source of meaning and truth–the Cartesian cogito."

یعنی انسان پرست روشن خیالی کی جانب سے روایت اور اتھاریٹی کا عقل اور طبعی سائنس کے حق میں انکار، جس کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ خود مختار فرد (کی عقل) ہی معنی اور سچائی کا واحد سرچشمہ ہے۔

بالفاظ دیگر اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ: جدیدیت دراصل ان نظریاتی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کے مجموعہ کا نام ہے جو ستر ہویں اور اٹھارویں صدی کے یوروپ میں روایت پسندی (Traditionalism) اور کلیسائی استبداد کے رد عمل میں پیدا ہوئی۔

تعریف سے بخوبی یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ جدیدیت اور اس کے نظریات کی ترویج کلیسائی استبداد کے رد عمل کے طور پر ہوئی، جس کی تاریخ یہ ہے کہ یورپ میں کلیسا کا ظالمانہ نظام عروج پر تھا، مزید پادریوں کے قدیم یونانی فلسفے اور عیسائی معتقدات کے

امتزاج سے خود ساختہ نظریات کسی بھی آزاد علمی تحریک کے لیے روڑے اٹکا رہی تھی، اور پادریوں کا شاہی حکومتوں کے ساتھ گٹھ بندھن کی وجہ سے استبدادی نظام قائم ہو چکا تھا ۔دوسری طرف اسپین کی اسلامی تہذیب کے ساتھ طویل تعامل کی وجہ سے عیسائی دنیا میں حریت فکر کی ہوائیں آنے لگی تھی، ان سب اسباب و عوامل نے استبداد کے خلاف شدید رد عمل پیدا کیا، جس کی وجہ سے جدیدیت کی تحریک کا آغاز ہوا۔

اس تحریک نے مذہبی عصبیتوں، روایت پسندی اور تنگ نظری کے خاتمہ کو اپنا اصل ہدف بنایا، رد عمل میں شدت اور غلو کی وجہ سے یہ اپنے انتہاء کو پہونچ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مذہب اور اس کے معتقدات کے بالکل خلاف ہو گئی۔

اس تحریک کو چند مشہور فلاسفروں اور مفکرین کی حمایت حاصل رہی اور انھوں نے اپنے افکار و نظریات کے ذریعے اس تحریک کو بنیاد فراہم کیا، سب سے پہلے ان کا حملہ انسان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر ہوا اور انھوں نے تصور علم اور ذریعہ علم میں یکسر تبدیلی پیدا کر دی، جس سے انسان مکمل طور سے مادیت کا پرستار بن گیا، انہوں نے تصور علم میں اس طرح تبدیلی کی کہ حقائق کی دریافت اور اس کے تیقن کے لیے عقل، تجربہ اور مشاہدہ کو کافی سمجھا، جس کی وجہ سے وحی الٰہی کا تصور اور مابعدالطبیعیاتی (Metaphysics) نظریات خود بخود مسترد ہو گئے۔

اس تصور علم کے نظریہ کو پیش کرنے میں بنیادی کردار فرانسس بیکن، رینے ڈیکارٹ اور تھامس ہوبس کا رہا۔

تصور علم میں اس تبدیلی کی وجہ سے انسانی سماج کے ہر محاذ پر نہایت خطرناک اثرات مرتب ہوئے۔

اس تحریک کے اثرات ونتائج :

مذہبی محاذ پر اس تحریک نے الحاد اور تشکیک کو جنم دیا، جس کی بناء پر بے شمار افراد یا تو ملحد ہوگئے یا پھر مذہب سے کلیتہً بیزار اور لا تعلق ہوگئے، والٹیئر اور ڈیکارٹ ان دونوں فلسفیوں نے الحاد کو فروغ دیا اور اپنی نظریات کی اشاعت سے لوگوں کا ایمان، مذہب سے ہٹا دیا؛ جب کہ ہیگل جیسے متشکک نے مذہب کو تسلیم تو کیا؛ لیکن اسے عقل کے تابع بنا دیا اور مذہبی حقائق کو دیگر عقلی مفروضات کی طرح قابل تغیر قرار دیا۔

سیاسی محاذ پر اس تحریک نے انسانی حریت کا تصور پیش کیا، جس سے آزادی فکر، آزادی اظہار اور حقوق انسانی کے تصورات عام ہوئے اور اس محاذ پر جن فلسفیوں کے افکار

و نظریات کو استعمال کیا گیا وہ ''تھامس ہوبس، جان لاک، والٹیئر، مانٹیسکو اور روسو'' ہیں، تھامس ہوبس نے حتمی اقتدار اعلیٰ کا تصور، سیاسی فلسفہ کی بنیاد قرار دیا، جان لاک نے عوام کو اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا، والٹیئر نے انسانی حریت کا تصور پیش کیا؛ جبکہ مانٹیسکو اور روسو نے جمہوریت کی بنیاد ڈالی اور اس کے نظریات عام کئے۔

معاشی محاذ پر اس تحریک نے سرمایہ دارانہ معیشت اور نئے صنعتی معاشرہ کو جنم دیا، جس کی بنیاد ایڈم اسمتھ کی معاشِ فکر تھی، پھر جب مزدوروں کا استحصال ہونا شروع ہوا تو اسی فکر و فلسفہ سے اشتراکی نظام کا تصور پیدا ہوا، جو کارل مارکس کے فکر کا نتیجہ تھی، یعنی ایسی فکر، جس میں محنت کش کو بالادستی حاصل ہو۔

اخلاقی محاذ پر اس فکر نے افادیت کا تصور عام کیا، یعنی اخلاقی قدروں کا تعلق افادیت سے ہے، جو رویے سماج کے لیے فائدہ مند ہیں، وہ جائز رویے اور جو سماج کے لیے نقصان دہ ہیں، وہ ناجائز رویے قرار پائے اور یہ کہ افادیت، اخلاق کی واحد کسوٹی ہے۔

امریکہ کی آزادی، برطانیہ میں جمہوریت کی تحریک، فرانس کا انقلاب اور اکثر مغربی ممالک کی تحریکیں جدیدیت کے ان افکار سے متاثر تھیں، بیسویں صدی میں اکثر ممالک ان افکار کے پرزور داعی اور مبلغ بن گئے اور اس دور کو روشن خیالی اور نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا اور اس سے پہلے کے دور کو تاریخ میں ظلماتی دور سے یاد کیا جانے لگا۔

اس تحریک کے اصل اصول آزادی، جمہوریت، مساوات مرد و زن، سائنسی طرزِ فکر، سیکولرازم اور روشن خیالی قرار پائے اور ان کو دنیا بھر میں عام کرنے کی کوشش کی گئی اور اس تحریک کے اثرات سے اسلامی دنیا بھی نا بچ سکی، انہوں نے بھی اس کے اثرات کو بسر و چشم قبول کیا اور اس کے اصول کو معذرت خواہانہ انداز سے اسلامی اصولوں کے ساتھ تطبیق دینے لگے، جس کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے اسلامی عقائد اور ان کے اصول کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی، اس لیے اس جدیدیت کے دور میں ضروری ہے کہ ان اصولوں کا اسلامی اصولوں سے موازنہ کر کے ان کا علمی طور پر محاکمہ کیا جائے اور ان کا مکمل رد کیا جائے، تاکہ اسلامی عقائد اور احکامات کے تعلق سے عوام الناس متزلزل نا ہو اور نا ہی کسی غلط فہمی یا تشکیک کا شکار ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مکمل طور سے اسلام کا خادم بنائے اور اسلامی طرز کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

آمین ثم آمین

قوموں کے زوال کا اُن کی نوجوان نسل پر اثر

جرنو ہندی

کسی بھی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ (دولت) اُس کے نوجوان ہوتے ہیں۔ اگر یہ گمراہ ہو جائیں تو قوم پستی میں جانے لگتی ہے، اور جب بھی کوئی قوم پستی کا شکار ہوتی ہے، تو اُس کا سب سے پہلا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اُن کے نوجوان دو سنگین بیماریوں میں مبتلا ہونے لگتے ہیں:۔

- بے مقصد زندگی
- شناختی بحران

آیئے سب سے پہلے اِن دو بیماریوں کے بارے میں جاننے اور اِس کے پیچھے کی وجہوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اُس کے بعد ان شاءاللہ اِن پریشانیوں سے نکلنے کے طریقوں پر بھی بات کریں گے۔

بے مقصد زندگی

زوال پذیر قوم جس کا فکری انحطاط ہوا ہو، اپنے زیادہ تر نوجوانوں کو دو چیزیں کبھی بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں دے پاتیں۔

پہلی چیز: عقیدے کا کامل علم

اِس معاملے میں اُن سے جو غلطی سرزد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب بات نئی نسل کو دینی عقیدہ سکھانے کی آتی ہے، تب یا تو یہ غفلت میں پڑ کر اُسے بھلا بیٹھتے ہیں، یا اگر عقیدہ سکھانے کی کوشش کرتے بھی ہیں تو یہ اپنے عقیدے کو عقلی دلیلوں پر مبنی علمی نتیجے کی طرح نہیں؛ بلکہ ایک رسم کی طرح سکھاتے ہیں، جب کہ عقیدہ عقلی طور پر ثابت کی جا سکنے والی وہ معتبر فکرِ مستنیر ہے جو انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے تمام سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ مثلاً: اِس دنیا سے پہلے کیا تھا؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ ہمیں کس نے بنایا؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

مسلمان جس عقیدے پر ایمان رکھتا ہے وہ ہے "لا اله الا الله، محمد رسول الله" یعنی کوئی اله نہیں سوائے اللہ کے، اور محمد ﷺ اُس کے رسول ہیں۔

یقیناً اِس عقیدے سے نکلنے والے احکامات پہ تبھی مستقل طور پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے، جب اِس پر کامل یقین ہو، اور یقینِ کامل کے لیے عقل اور تجربے کا استعمال لازم آتا ہے۔ کسی کلمے کو محض اِس لیے پڑھنا کہ اُسے خاندان کے دوسرے لوگ پڑھا کرتے ہیں، کبھی بھی کامل یقین پیدا نہیں کر سکتا۔ اِس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر مسلمان اپنی آل اولاد کو اچھے ڈھنگ سے عقیدہ سمجھائے، اور اُسے یقین کی حد تک پہنچنے میں مدد کرے۔

مگر کیا حقیقت ایسی ہے؟ ایسے کتنے نوجوان ہیں جنہیں اُن کے ماں باپ نے عقیدے کو عقلی طور پر ثابت کر کے سکھایا ہے؟ شاید ایسے 0.05% نوجوان بھی ہمارے آس پاس نہیں ملتے۔ اِتنا ہی نہیں، حالت یہ ہے کہ عقیدے کو عقلی طور پر ثابت کرنا تو دور کی بات ہے، ایسے والدین بھی بہت کم ملیں گے، جنہوں نے سیدھے سیدھے ہی سہی؛ مگر یہ کہہ کر اپنے بچوں کو کلمہ "لا اله الا الله، محمد رسول الله" سکھایا ہو کہ یہ کلمہ ہی ہمارا عقیدہ ہے، اور اِس پر ایمان رکھنا دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

سچ بتائیے، کیا آپ کے والدین نے کبھی آپ کو اِس طور سے سمجھایا ہے؟!

اب جب عقیدے کو صحیح طور پر نہیں سکھایا جاتا ہے، تو اِس کے دو اثرات مرتب ہوتے ہیں:۔

ا۔ چھوٹے چھوٹے شیطانی سوالوں کے سامنے ہار جانا اور ایمان کا اِس قدر کمزور ہو جانا کہ جیسے ایمان باقی ہی نہ ہو۔ جیسے :۔

ا: اگر اللہ سچ میں وجود رکھتا ہے، تو دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ اگر اللہ رحم کرنے والا ہے، تو دنیا میں اِتنے غم، پریشانیاں، دکھ اور مظالم کیوں ہیں؟

۔۲۔ گر اسلام ہی حق ہے تو اللہ تعالیٰ نے سبھی کو مسلمان کیوں نہیں بنایا؟ وغیرہ وغیرہ۔

ب۔ زندگی کا صحیح مقصد سمجھ میں نہیں آنا؛

چونکہ عقیدہ ہی وہ چیز ہے، جو ہمیں ہمارے بے بنیاد سوالوں: جیسے اِس دنیا سے پہلے کیا تھا؟ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ ہمیں کس نے بنایا؟ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کا جواب دیتا ہے۔ سو اگر عقیدہ ہی سمجھ میں نہ آئے تو کیا اِن سوالوں کے ساتھ زندگی کے مقصد سے متعلق اہم و بنیادی سوالوں کے جوابات مل پائیں گے؟ بالکل بھی نہیں! نتیجتاً یہیں سے اُس بیماری کی شروعات ہوتی ہے جسے **بے مقصد زندگی** کہا جاتا ہے، اور بعد میں یہی بیماری اُس دوسری سنگین بیماری کو جنم دیتی ہے جسے **شناختی بحران** کہا جاتا ہے۔

دوسری چیز۔ اپنی تاریخ کا علم

یعنی اپنی قوم کی ماضی سے واقفیت۔ جیسے ہماری قوم کی شروعات کہاں سے ہوئی؟ کن حالات میں ہوئی؟ کن لوگوں کی کاوشوں اور قربانیوں کے نتیجے میں ہوئی؟ اور یہ قوم کن کن ادوار سے گزری ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر اِن اہم باتوں سے نئی نسل کو واقف نہ کرایا گیا ہو تو اِس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ **نوجوانوں کو کوئی ایسا ہیرو نہیں مل پاتا جس سے وہ اِتنے متاثر ہو سکیں کہ وہ بھی اُنہیں کے جیسا بننا چاہنے لگیں۔** جب ایسا نہیں ہو پاتا تو وہ خالی پن کا شکار ہونے لگتے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ وہ یوں ہی رہ جاتے ہیں؛ بلکہ وہ اپنے آس پاس موجود اُن لوگوں میں اپنے لیے آئیڈیل وہیرو ڈھونڈنے لگتے ہیں جو اُن سے زیادہ مشہور اور قابل ہوں۔ پھر اُسی کے جیسا بننے کے قاعدے اپنانا شروع کر دیتے ہیں، یا پھر جس کسی تاریخی ہیرو کی فلم اُسے آس پاس سے حاصل ہوتی ہے، (بھلے ہی وہ تاریخی ہیرو غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو) اُسے ہی اپنا ہیرو بنانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اِس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُن کے اندر اپنی قوم کی رہی سہی خاصیتیں بھی ختم ہونے لگتی ہیں اور وہ غیر قوم کی خصوصیات کو اپنانے لگتے ہیں، یہاں تک کہ مکمل طور پر اپنی قوم سے الگ تھلگ انداز اپنا لیتے ہیں۔

یہی حال آج مسلم نوجوانوں کا ہے چونکہ اِنہیں خالد بن ولیدؓ، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، محمد بن فاتحؒ، اور ٹیپو سلطانؒ کی بہادری اور دلیری کا علم نہیں دیا گیا، اِس لیے آج اِن کے ہیرو مہاراناپرتاپ، شیواجی بھگت سنگھ (جو کہ ایک ناستک تھا) اور چندر شیخر آزاد ہو گئے ہیں۔

جبکہ تاریخ کا تھوڑا سا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اصل میں سچے دلیر کون لوگ تھے۔

چونکہ اِنہیں عمر فاروقؓ، عمر بن عبد العزیزؒ، اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے اندر انصاف اور فلاحی حکومت کے بارے میں نہیں بتایا گیا، اِسی لیے آج اِن کے ہیرو چندر گپت موریہ، پرتھوی راج چوہان، وکرم آدتیہ اور اشوک ہو گئے ہیں۔

چونکہ اِنہیں ابنِ فرناس، ابنِ سینا، ابنِ خلدون، اور الخوارزمی جیسے مسلم سائنس دانوں سے روشناس نہیں کرایا گیا، اِسی لئے آج اِن کے ہیرو آریہ بھٹ، رام آنج، اور جگدیش چندر باسو ہو گئے ہیں۔

غرض یہ کہ ایسی سینکڑوں مثالیں ہمارے درمیان موجود ہیں اور حقیقت کا تھوڑا سا مطالعہ ہمیں حیران کر دیتا ہے کہ اپنی ہی قوم میں کثیر تعداد میں ہیرو موجود ہوتے ہوئے ہم غیر قوم کے ہیروسے کام چلا رہے ہیں۔

اسلامی عقیدے پر کامل ایمان اپنے آپ میں غیر اسلامی فکر کے حاملین کو ہیرو بنانے سے روکتا ہے، کیونکہ اسلامی عقیدے کی تعلیمات اور کفریہ فکر پر چلنے والے جاہل ہیرو کی سوچ کبھی ایک نہیں ہوتی بلکہ ان کا آپس میں سیدھا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر کسی کا ہیرو کافر ہے؛ مگر اُسے لگتا ہے کہ اب بھی وہ کامل اسلامی عقیدہ رکھتا ہے، تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے عقیدے کے متعلق تھوڑا غور وخوض کر لے۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے عقیدۂ توحید اور اس کے مقتضیات و موجبات کو مسلسل نظر انداز کرنے اور کفریہ افکار کے حاملین کو اپنا آئیڈیل بنانے لگتا ہے، تو وہ اپنے ایمان کو محفوظ نہیں رکھ پاتا ہے اور اپنے کافر ہیرو ہی کے نقش قدم پر گامزن رہتے ہوئے ایک دن اپنے ایمان کی دولت سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مسلم نوجوانوں کو دو چیزیں (عقیدہ اور اپنی تاریخ کا علم) صحیح طرح سے نہیں مل پانے کی وجہ سے ہی بے مقصد زندگی جیسی بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری بڑی بیماری

شناخت کا بحران

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا، جب کوئی شخص اپنی زندگی کے صحیح مقصد کو سمجھنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو وہ دفعتاً اپنے آس پاس دیکھتا ہے اور زندگی کا مقصد ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہیں سے شناختی بحران (Identity Crisis) کے مرض کی شروعات ہوتی ہے۔

اِس مرض کو اگر آسان الفاظ میں سمجھنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ :

زندگی کا مقصد تلاش کرنے کی جستجو کا ایسا شکار ہونا کہ اپنے عقائد کی تعلیم سے بے پرواہ ہو کر کسی شخص کا ایسے حالات میں مبتلا ہو جانا کہ کبھی X کو کامیاب دیکھ کر اُس کے مقصد کو ہی اپنا مقصد بنانے کے پیچھے لگ جانا، تو کبھی Y کی کامیابی دیکھ کر اُس کے مقصد کو ہی اپنا مقصد بنانے کا ارادہ کر لے، حتیٰ کہ کسی بھی حال میں خود کو ایک منزل پر قائم نہ رکھ پانا **۔ کسی کا ایسی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جانا ہی شناختی بحران (Identity Crisis) کہلاتا ہے۔**

ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا ہو کہ عقیدہ اور مقصد کا کسی کی شناخت سے کیا تعلق؟

اِس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ عقیدہ نہ صرف زندگی کو ایک مقصد دیتا ہے؛ بلکہ عقیدہ اور مقصد، دونوں کو ماننے کی وجہ سے انسان کی ایک شناخت بنتی اور شخصیت مستحکم ہوتی ہے۔

اب یہ بات تو خود ہی سمجھ میں آنے والی ہے کہ جس شخص کی اپنی کوئی شخصیت ہو، معاشرے میں اپنی پہچان ہو، اُسے زیادہ عزت و قدر ملتی ہے نہ کہ ایک ایسے شخص کو جسے سماج میں کوئی پہچان حاصل نہیں ہو؟ یہ پہچان حاصل کر کے خود کو معاشرے میں زیادہ محفوظ اور زیادہ مقبول بنانے ہی کی کوشش ہوتی ہے کہ آج کا کوئی نوجوان کبھی ٹک ٹ

اک میں مشہور ہو کر، کوئی یوٹیوب ویڈیو بنا کر، کوئی ایکٹر تو کوئی سِنگَر بن کے خود کو مشہور کرنا اور اِس طرح اپنی ایک شخصیت اور اپنی ایک پہچان بنانا چاہتا ہے۔

اِس طرح یہ سارا کھیل پہچان (Identity)حاصل کرنے کا ہو جاتا ہے۔

اِس لئے اگر یہ کہا جائے کہ پہچان کی سمسیا، یعنی شناختی بحران ایک بیماری ہ ے، اور یہ اُن لوگوں کو لگتی ہے جن کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی، ت و غلط نہیں ہو گا۔ بلکہ تھوڑا غور کریں تو یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جو شخص خود (جسے علامہ اقبال نے ''خودی'' کہا ہے) کو نہیں جانتا، وہ کبھی بھی اپنی ایک شخصیت نہیں بنا سکتا، اور خود کی کامل شناخت بنا کسی عقیدے کو اپنائے نہیں بنتی۔

یعنی کل ملا کر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ **عقیدہ مضبوط کر کے ، اور اپنے عقیدے کے مطابق اپنی تاریخ کا صحیح علم حاصل کر کے نہ ص رف شناختی بحران کی بیماری سے بچا جا سکتا ہے، بلکہ بے مقصد زندگی کی بیما ری کا حل بھی وہیں سے نکلتا ہے۔** جس کا عقیدہ مکمل ہو گا اُس کو خودی کا علم ہو گا اور جسے خودی کا علم ہو گا اُس کی ایک شخصیت ہو گی جو ایک مقصد کے لئے)مقصدِ حیات بھی عقیدہ ہی سے نکلتا ہے (کام کر رہا ہو گا،

اور اُس کی یہی شخصیت اُس کی پہچان)شناخت (بنے گی، اور اُسے کبھی بھی ''**شناختی بحران** ''نام کی بیماری کبھی بھی چھو بھی نہیں پائے گی۔

ذمے دار کون؟

آج ہمارا سماج ایسے نو جوانوں سے بھرتا جا رہا ہے جو اِس مضمون میں زیرِ بحث بیماریوں کی چپیٹ میں آ چکے ہیں۔ آخر کون لوگ ہیں جو لا پرواہی او ر غفلت میں کچھ یوں پڑے رہے کہ اپنی قوم کے مستقبل، یعنی قوم کے نو جوانوں کو ضروری تربیت اور رہنمائی فراہم نہ کر پائے۔

اِس کے مختلف جوابات ہو سکتے ہیں، ناچیز کی بات مانیں تو اِس کے ذمے دا ر وہ تمام ایسے لوگ رہے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر ہمارے سرپرست رہے ہیں۔ یعنی ماں باپ، بڑے بھائی، دادا دادی، نانا نانی، اساتذہ، اور خاص طور پر معاشرے میں اثر و رسوخ رکھنے والے وہ علماء جن کو مسجد کے ممبروں سے لوگوں کو خطاب کرنے اور سمجھانے کا موقع ملا کرتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اِس میں ہم نو جوانوں کی غلطی نہیں، مگر ہماری ذمے دار ی بعد میں آتی ہے، اور اُن کی پہلے۔ ہاں، جب ہم بالغ ہو گئے، اور سوچنے سمجھنے کی قوت پیدا ہو گئی تب سے ہم بھی ذمے دار ہوئے، مگر پھر بھی

سب سے بڑے ذمے دار تو وہی لوگ کہلائیں گے جنہوں نے ہمیں دینی م احول نہیں دیا، دینی تعلیم کو لے کر ہمیں آشنائی نہیں بخشی، ہمیں دین مح ض ایک رسم کے طور پر سونپ دیا، بنا یہ سمجھائے کہ اِس کی کیا اہمیت ہ ے، کیسے **یہ دین اللہ کا انسانوں کی رہنمائی اور اُس کی دونوں جہان میں ک امیابی کے لئے دیا گیا بیش قیمتی تحفہ ہے۔**

ہم نو جوانوں میں بیشتر کے حالات ایسے بیتے ہیں کہ ہر روز ہمارا ایک بڑا و قت اسکول میں گزرا کرتا تھا، جہاں ہمیں کچھ ایسی چیزیں پڑھائی اور سکھائی جاتی تھیں، کہ آج غور و فکر کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے، کہ وہ چیزیں ہمارے عقیدے کے بالکل خلاف تھیں۔

مثال کے طور پر

ایک طرف اسلام کہتا ہے کہ اِس دنیا میں سب سے پہلے آدم علیہ السلام او ر حوا علیھا السلام آئی تھیں؛ دوسری طرف ہمیں بتایا جاتا تھا کہ انسان پہلے بندر تھے، اور دھیرے دھیرے ارتقاء کی بدولت بندروں سے انسانی شکل می ں آئے، اور آدی مانَو کہلائے۔

ایک طرف اسلام کہتا ہے کہ اللہ ہی سب کا مالک ہے، لہٰذا ہر معاملے میں اللہ ہی کی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہئے؛ دوسری طرف ہمیں سیکولرز م سکھایا جاتا تھا جس کے مطابق اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکام کا سماجی زندگی میں کوئی رول نہیں ہونا چاہئے، بلکہ دین کو حکومت کے معامل ات میں مداخلت کرنے کی کوئی اجازت نہیں ملنی چاہئے۔

ایک طرف اسلام کہتا ہے کہ قانون سازی صرف اللہ ہی کے لئے خاص ہ ے، یعنی کون چیز حرام (Unlawful)ہو گی، کون چیز حلال (Lawful ہو گی، یہ فقط اللہ ہی کو طے کرنے کا حق ہے؛ دوسری طرف ہمیں پڑ ھایا جاتا تھا کہ جمہوریت ہی بہترین نظامِ حکومت ہے، کیوں کہ اِس میں ل وگوں کے چنے ہوئے نمائندے پارلیمنٹ میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں، اور خود ہی حرام (Unlawful)اور حلال (Lawful)طے کرتے ہیں۔

ایک طرف اسلام کہتا ہے بے پردگی بری چیز ہے، اور بنا شادی کے جسمانی تعلق قائم کرنا حرام ہے؛ دوسری طرف ہمیں سکھایا یہ جاتا تھا کہ فیشن کرنا اور رضا مندی پر منحصر تعلقات)جیسے گرل فرینڈ بائے فرینڈ (قائم کرنا ماڈ رن کلچر)نئی تہذیب (ہے اور یہ حریت (freedom)کا تحفہ ہے اور اِ سے اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک طرف اسلام کہتا ہے کہ عصبیت (Nationalism/Tribalism حرام ہے؛ تو ہمیں پڑھایا جاتا تھا کہ وطن پرستی سب سے اچھی چیز ہے۔

اِس طرح کی ایسی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مسلسل ٹکراؤ ہے جس سے گزر کر آج کا نو جوان اِن تباہ کن حال ات کو پہنچا ہے۔

جہاں ایک طرف اسکول میں یہ حالات تھے؛ تو وہیں گھر پر بھی ہمیں کوئی یہ بتانے والا نہیں تھا کہ اسکول میں تمھیں جو نظریات سکھائے جا رہے ہی ں، اُن میں سے فلاں فلاں نظریوں میں یہ پریشانی ہے، اِن پر یقین مت کرنا، یا یہ کہ اسلامی عقیدہ کیسے سب سے اچھا ہے۔ غیر اسلامی افکار کیسے برے اور غیر اخلاقی ہیں۔ یہ بتانے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم میں سے ا کثر کے گھر پر تو یہی حال تھا۔ جو بچے آج کے وقت میں شناختی بحران وال ی بیماری میں مبتلا ہیں اُن کے بارے میں پتا کریں تو معلوم ہو گا، کہ اُن میں سے اکثر اپنے عقیدے اور دینی احکام سے نا آشنا ہیں۔ نتیجتاً وہ دین سے دور ہو گئے ہیں۔

مگر کیا آج حالات اچھے ہوئے ہیں؟ کیا آج کے سرپرست)ماں باپ، بڑے بھائی، اساتذہ، سرکاری لیڈر وغیرہ (کوئی مثبت کوششیں کر رہے ہیں؟۔ نہی ں !بلکہ آج کے حالات تو اور بھی زیادہ سنگین ہو گئے ہیں۔ پہلے کی طرح بچوں کے دماغوں میں غیر اسلامی افکار تو ڈالے ہی جا رہے ہیں، مگر اُس س ے بڑھ کر ہوا یہ ہے کہ اسلام کو کھلے عام برا بتایا جا رہا ہے، LGBT Qاور گندی فلمیں عام کی جا رہی ہیں، بچوں میں الحاد (Atheism)ک ا عقیدہ بھرنے کی پوری کوششیں ہو رہی ہیں، اور بھی نا جانے کیسی کیسی نئ ی شیطانی آفتیں ہیں جو کھل کر کے مسلمان بچوں سے اُن کا بچا کچا ایمان بھی چھین لینے پر تلی ہوئی ہیں۔

ایسے میں اگر ہم بھی اپنے بڑوں ہی کی طرح بے پروا ہو جائیں اور نئ نسلو ں کی فکر نہیں کریں گے تو سوچئے کیا حال ہو گا اِن بچوں کا؟۔ کیا یہ دین پر قائم رہ پائیں گے؟

ہمارے بڑے تو اِس معاملے میں کبھی بھی سخت نہیں ہوئے۔ نہ ہی اِس کی اہمیت سمجھی، اور نقصان آج ہمارے سامنے ہے۔ ہم کمزور سے کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آج ہم بحیثیت ایک قوم کے ہر جگہ نشانہ بنائے جا رہ

ے ہیں۔ دشمن ہم پر ٹھیک ویسے ہی ٹوٹ پڑا ہے جیسے بھوکے کھانوں پر ٹو ٹ پڑتے ہیں۔

وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اب اپنی غفلت کی نیند سے باہر نکل آئیں اور اپن ے تمام وسیلوں کو بروئے کار لاتے ہوئے خود عقیدہ اور دین سیکھنے میں ل گ جائیں اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں اور اپنے سے چھوٹوں کو دین کی حقیق ت سے رو برو کرانے کی مہم چھیڑ دیں۔ اُنھیں بتائیں کے دشمن کس طرح ہمیں کمزور کرنے اور ستانے میں لگا ہوا ہے، اور ایسے میں ہم کس طرح ا پنے ایمان کی حفاظت کرنی ہو گی۔

ایک کامل حل یہی ہے کہ ہمیں اسلامی عقیدے کے صحیح اور کامل علم کو فر وغ دینا ہو گا۔ اِس دوران نو جوانوں کے من میں اٹھنے والے ہر اُس سوال کا علمی اور عقلی جواب دینا ہو گا، جو عقیدے کو کمزور کرنے والا ہوتا ہے، اور ہر اُس غیر اسلامی فکر کا منھ توڑ جواب دینا ہو گا جو ہماری نئ نسلوں کو دھوکے اور فریب میں ڈال کر ہمیں دینِ اسلام سے دور کرنا چاہتی ہے۔

اللہ ہم سب لوگوں کو کہنے سننے سے زیادہ عمل کرنے کی توفیق نصیب فرم ائے۔ جو باتیں حق ہوں اُنہیں خود بھی سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے اور عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

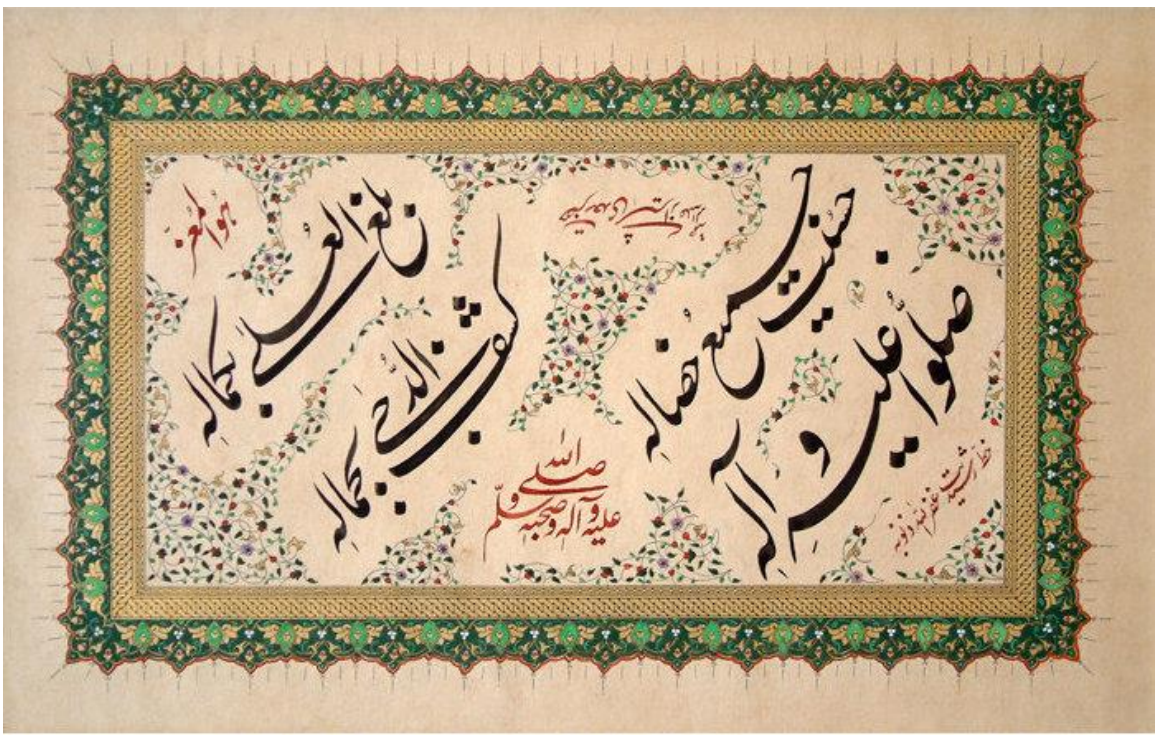

بلغ العلى بكماله
كشف الدجى بجماله
حسنت جميع خصاله
صلوا عليه وآله
صلى الله عليه وآله وصحبه وسلم

انسان کی ترقی کیا ہے؟

مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ

آج کل ترقی کا تذکرہ تحریروں اور تقریروں میں بہت زیادہ آرہا ہے اور عموماً سبھی انسان ترقی کے خواہاں اور اس کے دلدادہ بنے ہوئے ہیں آخری دو تین صدیوں میں دنیاوی چیزوں میں بہت ترقی ہوئی ہے، سائنس کی ایجادات نے انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا وہ ہواؤں میں اڑنے لگا اور چاند پر پہنچ گیا اور دوسرے سیاروں میں پہنچنے کے لیے تگ و دو میں لگا ہوا ہے، نئ نئ مصنوعات سامنے آرہی ہیں اور انسان اس سے مستفید ہو رہا ہے، فلک بوس عمارتیں بن رہی ہیں، نئے نئے ڈیزائن ہیں انجینئرنگ کا کمال عروج پر ہے، جس سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے اور الیکٹرانک مصنوعات نے محو حیرت بنا رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ مادی ترقی انسان کے منافع اور مرافق زندگی کے لیے بہت کام کی چیز ہے مومن، کافر اور نیک و بد سبھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

بعض ناواقف جو یہ سمجھتے ہیں کہ ایجادات سے اور ان کے استعمال سے شریعت اسلامیہ منع کرتی ہے ان کا یہ خیال غلط ہے، شریعت اسلامیہ کے فرائض و

واجبات کو ادا کرتے ہوئے اور ممنوعات و محرمات سے بچتے ہوئے شریعت کے اصول کے مطابق جو شخص کسی نئ یا پرانی ایجادات سے متمتع ہونا چاہے تو اس کے لیے دین اسلام میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اب تک جس ترقی کا ذکر ہوا یہ سب مادی ترقی ہیں ۔سوال یہ ہے کہ انسان خود کیا ہے ؟کیوں پیدا کیا گیا ؟ اور اس کی اپنی ذاتی ترقی کس چیز میں ہے؟ خود انسان کے اندر کتنی انسانیت باقی رہ گئی ہے اور انسان کو انسانیت میں ترقی حاصل ہوئی ہے؟ اس کو دیکھنا چاہیے۔ اگر تنزل ہوا ہے تو اس نقصان کی تلافی کا کیا طریقہ ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے سب سے پہلے انسان سیدنا حضرت ادم علی نبینا و علیہ الصلاۃ والسلام تھے، ان سے ہی اس دنیا میں بنی نوع انسان کی نسل چلی اور پھلی پھولی، دنیا کے سارے براعظم ان سے آباد ہیں حضرت ادم علیہ السلام انسان کے صرف بابا ہی نہیں تھے؛ بلکہ خداوند قدوس کے سب سے پہلے پیغمبر بھی تھے، جب ان کو جنت سے اتار کر اس دنیا میں بھیجا گیا تھا تو خالق کائنات جل مجدہ نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے گی، سو جو شخص میری ہدایت کی اتباع کرے گا ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور میری ایات کو جھٹلایا یہ لوگ دوزخ والے ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں انسان یوں ہی کھانے پینے سونے اور بے مقصد زندگی گزارنے کے لیے نہیں بھیجا گیا؛ بلکہ وہ اس جہان رنگ و بو میں اس لیے آیا

ہے کہ اپنے خالق و مالک کی ہدایت پر چلے خدا پاک پر ایمان لائے، اس کی ہدایت کو مانے اور انکار کر کے دائمی عذاب نار میں اپنی جان کو جھونکنے کی راہ اختیار نہ کرے۔ خداوند قدوس جل مجدہ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے انسان کے عہد اول سے لے کر یکے بعد دیگرے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو مبعوث فرمایا، پھر سب سے آخر میں آخر الانبیاء والمرسلین، سید البشر محمد عربی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کو خاتم النبیین کے لقب سے مشرف فرمایا، نبوت و رسالت آپ پر ختم فرما دی اور آپ کو رہتی دنیا تک کے لیے تمام انسانوں کا نبی اور رسول بنا دیا اور اپ کو حکم دیا کہ آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں اور آپ کی زبانی یہ بھی اعلان کرایا، قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، اس امت میں سے جس کسی کو بھی میری بعثت کا علم ہو خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی، پھر وہ اس حالت میں مر جائے کہ میں جو دین لے کر بھیجا گیا ہوں اس کو نہ مانا تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہوگا، نیز آپ نے ارشاد فرمایا مجھ سے پہلے نبی کی بعثت خاص کر اس کی اپنی قوم کی طرف ہوتی تھی اور میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں ہر گورے اور کالے کی طرف بھیجا گیا ہوں ۔ اللہ جل شانہ نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید عطا فرمایا جو اللہ تعالی کی آخری کتاب ہے جو آخر امم کی ہدایت کے لیے آخر الانبیاء صلی

اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی، اس کتاب میں انسان اور جنات کا مقصد تخلیق واضح طور پر بیان فرمایا؛ چنانچہ ارشاد ہے اور میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں نیز یہ بھی ارشاد فرمایا اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دین کا طالب ہوگا سو وہ دین اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ اخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا، نیز ارشاد فرمایا آج میں نے تمہارے لیے دین کامل کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو دین ہونے کے اعتبار سے پسند کر لیا۔ قرآن مجید کی ان آیات شریفہ سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ انسان صرف خدائے وحدہٗ لا شریک کی عبادت کے لیے پیدا ہوا ہے اور خدا پاک نے اس کے لیے جو ہدایت بھیجی ہے اسی پر چلنے میں اس کی خیر ہے، دین اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ جل شانہ کے نزدیک معتبر نہیں ہے، جو کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا موت کے بعد آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا اور وہ تباہی دائمی عذاب نار کی صورت میں ہے، دین اسلام کامل دین ہے اس میں اعتقادات، عبادات، محاسن اخلاق، بہترین اداب معاشرت کی تعلیم دی گئی ہے اور انسان کو حیوانیت و بہیمیت سے بچا کر انسانیت کے اصل تقاضوں پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے، خدا کے آخری پیغمبر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ برگزیدہ اخلاق کی تکمیل کروں اور فرمایا بلا شبہ اللہ نے مجھے برگزیدہ اخلاق اور اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے، سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جن بلند اخلاق و افعال کی تعلیم دی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے جو اصول و آداب قولاً ارشاد فرمائے ہیں وہ دنیا کے کسی بھی دوسرے معاشرے میں نہ موجود ہیں نہ کسی کے یہاں ان کا تصور ہے، انسان کی ترقی اسی میں ہے کہ انسانیت اس کے ہاتھ سے نہ جاتی رہے اس کے اخلاق بلند ہوں اور حرام و حلال کی تمیز کے بغیر پیٹ نہ بھرتا ہو، حیوانوں کی طرح ہر جگہ منہ نہ مارتا ہو اور جانوروں کی طرح نفسانی خواہشوں کو پورا نہ کرتا ہو اور بے حیائی کی زندگی گزارنا اسے مبغوض ہو عفت و عصمت اس کا شعار ہو، حیا و شرم کو اپنے لیے لازم سمجھتا ہو اور کسب حلال سے تن ڈھکتا اور پیٹ بھرتا ہو۔

سائنس کی ترقی کوئی انسان کی ترقی نہیں ہے یہ تو ان چیزوں کی ترقی ہے جو انسانی وجود کے علاوہ ہیں، البتہ یہ انسان کی خادم ہے، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی خدمت گزار اشیاء کی ترقی ہو گئی، انسان تو اپنی ذاتی حالات میں وہیں ہے جہاں وہ عہد اول سے تھا، آنکھ سے دیکھتا ہے، کان سے سنتا ہے، پاؤں سے چلتا ہے، ہاتھ سے پکڑتا ہے، منہ سے کھاتا ہے، فضلہ نکالنے کی جگہ وہی ہے جو پہلے تھی، پرانے طریقے پر سوتا ہے، اٹھتا ہے بیٹھتا ہے پوری زندگی کے پرانے طریقے پر ہے، پیدا ہونے کا وہی ایک طریقہ ہے جو پہلے تھا باپ کے صلب سے مادہ نکلتا ہے ماں کے رحم میں جاتا ہے وہاں استقرار ہوتا ہے، چند ماہ بعد جان پڑ جاتی ہے، باہر آتا ہے دودھ سے پرورش پاتا ہے، آہستہ آہستہ پلتا بڑھتا ہے، بچہ ہے، جوان ہے، بوڑھا

ہے۔ یہی حالت آج بھی انسان پر گزرتے ہیں جو پہلے گزرتے تھے۔ انسان کی اپنی زندگی ذاتی حالات میں تو کوئی ترقی نہیں ہوئی، البتہ انسانیت کے جو اصل خد و خال اور اوصاف عالیہ ہیں ان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، بلند اخلاق اور بلند اوصاف کے اعتبار سے وہ بہت زیادہ گہرے گڑھے ہی میں گر چکا ہے، انسانی اوصاف بلند ہوں اور اخلاق عالیہ سے متصف ہوں تو پھر سے انسانیت اپنی جگہ پا سکتی ہے اور اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ انسان تنزل کے بعد ترقی کر گیا ہے۔

انسان کے اوصاف عالیہ میں سب سے اول تو یہ ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے، اس کے دین کو قبول کرے، یعنی اس کو وحدہٗ لا شریک تسلیم کرے، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اس کے اوامر و نواہی کو معلوم کرے، اس نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان کی تعمیل کرے اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے پرہیز کرے، اس کی عبادت کرے، جان و مال سے متعلق جو احکام ہیں ان کو انجام دے، نعمتوں پر خالق و مالک جل مجدہ کا شکر ادا کرے، تکلیفوں پر صبر کرے، خالق و مالک جل مجدہ کی عبادت میں اور اس کی یاد میں لگا رہے، دل سے بھی اسے یاد کرے اور زبان سے بھی، دیگر اوصاف عالیہ یہ ہیں کہ مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے، کسی کو زبان سے یا ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچائے، ناحق کسی کا مال نہ لے، آگے پیچھے کسی کی بے آبروئی نہ کرے، غیبت نہ

کرے، تہمت نہ باندھے، ضعیف پر رحم کرے، ایثار اور قربانی کا جذبہ ہو، تواضع ہو، تکبر نہ ہو، مال حلال کمائے، حلال کھائے، تمام ضرورتوں میں حلال ہی استعمال کرے، سخاوت اختیار کرے، خالق کائنات جل مجدہ کی مخلوق پر حلال مال خرچ کرے، کسی پر ظلم نہ کرے، اعمال میں ریاکاری نہ ہو، ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرے آخرت کی پیشی سامنے رہے اور وہاں کے لیے فکر مند ہو۔

دور حاضر کے انسان نے اخلاق عالیہ تو چھوڑ دی ہے اور انسانیت کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ایسے کاموں میں لگ گیا، جن میں خالق و مالک کی نافرمانی ہے اور جو انسانی شرافت کے سراسر خلاف ہیں، ان افعال کی وجہ سے وہ انسانیت سے محروم ہو گیا اور سمجھ یہ رہا ہے کہ میں ترقی کر گیا۔

مابعد جدیدیت: کیا انار کی ہے؟

احمد جاوید

مابعدِ جدیدیت کا فکری رجحان ایک سلبی رویے کا پروردہ ہے۔ اس رویے کا مرکزِ تحریک موجود سے اعراض اور مطلوب کو حتمیت کے ساتھ متعین کرنے سے گریز ہے۔ مابعد جدیدیت کے اساطین میں نٹشے، ہائیڈیگر اور سارتر ہیں ان سب کے ہاں مذکورہ بالا حقیقت کو آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک متضاد اور باہم متصادم تصورات عقل کے لیے ناقابلِ قبول ہوں گے مگر زندگی انھی حقائق سے عبارت ہے۔ ژاک دریدہ نے مابعد جدیدیت کو پس ساختیات کے نام پر ادبی نظریہ بنادیا ہے۔ اس کے نزدیک لفظ بھی معانی کا ویسا ہی ظرف ہے جیسا کہ ذہن ہے۔ مابعد جدیدیت میں دو نظریے ایسے ہیں جو اَب ان کا سرمایہ کہلا سکتے ہیں، یعنی نسائیت اور پس ساختیات۔

جدید مفکرین میں مشل فوکو ایک ایسا آدمی ہے جس کے ساتھ اپنے تعلق میں جو چیز سب سے زیادہ بامعنی اور پرکشش لگتی ہے، وہ ہے چڑ کی حد کو پہنچا ہوا اختلاف۔ بڑے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں۔ مکمل اختلاف اور مکمل اتفاق کی مصنوعی فضا سے بلند۔ فوکو غالباً جدیدیت کا آخری بڑا نظریہ ساز (Theorizer) ہے۔ یہاں نظریے یا تھیوری کا مطلب یہ ہے کہ ایسا معرف (Definer) وضع کیا جائے جس سے تمام چیزیں Define ہو

جائیں۔۔۔ اپنے اختلافات اور تضادات سمیت۔ اس کی ایک ضمنی تھیوری ہے جسے وہ Episteme کہتا ہے۔ Episteme کا ایک لفظ یا اصطلاح میں ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مادۂ علم بھی ہے، حدِّ علم بھی ہے اور مزاجِ علم بھی۔ فوکو کہتا ہے کہ ہر تہذیب کی یا بالفاظ دیگر ہر زمانے کی ایک مخصوص Episteme ہوتی ہے۔ اس تہذیب میں برپا ہونے والی کوئی علمی تحریک اور نظری سرگرمی اس سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ ایک زمانے کی Episteme دوسرے وقت کے لیے حوالہ تو ہے لیکن حجت نہیں بن سکتی۔ ایک ہی چیز کو دیکھنے کے لیے مستقل تناظر کامیابی کے ساتھ دریافت کر لینا یا انھیں ان کی کلیت اور جامعیت کے ساتھ قبول کر لینے کا کوئی موثر ضابطہ ایجاد کر لینا، Episteme ہے Post Modernism یا Post Modernity اس دور کا ایسا Episteme ہے جسے ابھی خود Define ہونا ہے۔ یہ کچھ ایسے نادیدہ اور غیر محسوس حدود کو نافذ اور قائم کر دینے والا ایک دائرہ ہے جس کا قطر اَبھی ناپا جانا ہے۔ انسانوں کی تہذیبی تاریخ میں شاید یہ پہلا واقعہ ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ اپنے تمام تسلسل کو، اپنی تمام بنیادوں کو، ان کے تمام اجزا سمیت منہدم کر کے ایک نئے Episteme کی دریافت کا دعویٰ اور اپنی تمام علمی، جمالیاتی، تہذیبی بلکہ قرار واقعی شدت پیدا کرنے کے لیے کہا جائے تو وجودی سرگرمیوں کو اس Episteme پر عملاً قائم کر کے دکھا دینا، Post Modernism ہے۔ یہ رویے علمی، ادبی، تہذیبی مظاہر میں نمودار ہونے کے باوجود اپنا تعارف نہیں کرواتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی

نظریے یا تہذیبی رویے کو اپنے تعارف کے لیے ماضی کی ضرورت ہوتی ہے جس سے Post Modernism خود کو بے نیاز دکھانا چاہتا ہے۔ تاہم ایک سادہ تعارف یہ ہے کہ جدیدیت ناکام ہو چکی ہے، کلاسیکیت لغو ہو چکی ہے، حقیقت کو دریافت کرنے کے تمام زاویے فنا ہو چکے ہیں اور حقیقت کی ترجمانی کرنے والے سبھی تصورات مضحکہ خیز حد تک بے معنی ہو چکے ہیں۔

اب انسان کو اور اس کے متعلقات کو چند نئی تعریفات سے define ہونا ہے۔ انسان کو اپنے علمی اور عملی Objects کے ساتھ تعلق کو بالکل نئی معنویت اور طرزِ احساس کے ساتھ از سر نو استوار کرنا ہے، یہ ہیں Post Modernism کے بنیادی مقاصد۔ مگر انھیں بتانے والا ان کا کوئی سیاق و سباق متعین کر کے نہیں دکھاتا۔ حتیٰ کہ خود اپنا تعارف بھی نہیں کرواتا۔ سو اس ساری گفتگو میں عین ممکن ہے کہ یہ چیز سامنے نہ آسکے کہ Post Modernism اپنی تعریف میں دیگر فکری themes کی طرح کچھ متعین اشارے یا واضح حدود رکھتی ہے یا نہیں۔ جس طرح ہم جدیدیت کی تعریف مقرر کر لیتے ہیں یا کلاسیکیت کے اصول بیان کر سکتے ہیں، اس طرح سر دست Post Modernism کو define نہیں کر سکتے۔ ویسے کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی کسی تعریف تک سہولت سے پہنچا جا سکے۔

اس گفتگو کے تین حصے ہیں،

۱) Post Modernism (کے محرکات کا تعین۔

۲) (اپنی موجودہ شکل میں یہ کن اجزا سے مرکب ہے؟

۳) (اس پر تنقید۔

گویا پہلا حصہ اس کے تاریخی محرکات پر مشتمل ہوگا، دوسرا حصہ اس کے احوال کا بیان ہوگا اور تیسرے میں اس پر نقد و نظر کا عمل ہوگا۔

کارتیزی روایت کی آمد کے بعد مغرب میں ایک چیز سے دستبرداری کا چلن شروع ہو گیا اور وہ یہ تھی کہ دیکارت سے پہلے غالب رجحان یہ تھا کہ چیزیں اپنے مظاہر اور دائرۂ ہستی

کے فرق کے باوجود ہم اصل ہیں۔ وہ چاہے مادی دنیا سے تعلق رکھتی ہوں، چاہے ما بعد الطبیعی عالم سے۔۔۔ دونوں اصل میں ایک ہیں۔ اور جس اصول کی بدولت یہ واحد الاصل ہیں وہ اصول اپنی ماہیت میں ما بعد الطبیعی ہے۔ اس کے ساتھ دوسری روایت یہ تھی کہ چیزیں خواہ ما بعد الطبیعی عالم وجود سے تعلق رکھتی ہوں یا طبیعی دنیا سے متعلق ہوں، ان کے Ontological استناد کا عمل ایک ہے۔ یعنی ان کی Ontological Logic ایک ہے۔ بہر حال اصولی رویہ یہی تھا کہ چیزوں کے ظاہری امتیازات کا اقرار کرتے ہوئے، ان کے طبیعی حدود کے فرق کو ملحوظ اور محفوظ رکھتے ہوئے ان کی اصل کو دریافت کیا جاتا تھا۔ مگر دریافت کا یہ عمل ان کے ظاہری امتیازات اور فعلیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک ما بعد الطبیعی منطق کی روشنی میں ہوتا تھا۔ اس سے بہت سارے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ طریقہ تو پرانا ہے کہ آدمی اس منطق ہی کا انکار کر دے، تاہم ایسا کر کے یہ کبھی نہیں ہوا کہ آدمی طبیعی اور مادی دنیا کے حقائق کو بھی خیر باد کہہ دے۔ ہوتا یہی آیا ہے کہ ما بعد الطبیعی تصورات پر مبنی منطق کا انکار ہستی کے Metaphysical اصول کا انکار بن جاتا ہے۔ لیکن اس انکار سے بھی وہ مسئلہ طے نہ ہو سکا جو آخر میں آکر دیکارت نے طے کیا۔۔۔ یعنی یہ دونوں اقلیمیں، طبیعی اور ما بعد الطبیعی یا مادی اور روحانی، ایک دلیل کا مدلول نہیں ہیں، ایک اشارے کا مشارٌ الیہ نہیں ہیں اور ایک بنیاد پر قائم جڑواں منارے نہیں ہیں۔ ان کا قانون اثبات، ان کی فعلیت کا نظام، ان کی معنویت کا مرتبہ، ان کی حقیقت کا درجہ۔۔۔ سب

مختلف ہیں۔اسی وجہ سے اس نظریے کو ثنویت کہا گیا۔دیکارت کا اصرار یہ تھا کہ جب تک ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے متوازی اور مستغنی حالت میں حقیقی اور مؤثر نہیں مانیں گے،اس وقت تک ہم ان مسائل کا نہ ادراک کر سکتے ہیں اور نہ انھیں حل کر سکتے ہیں جو انسانوں کو اپنی علمی، عملی اور اخلاقی نشوونما میں تقدیری انداز میں پیش آتے رہے ہیں۔جدید مغرب دیکارت کے دیے ہوئے اس حل سے آج تک وفادار چلا آرہا ہے۔روح اور مادہ دونوں ایک سی قطعیت کے ساتھ موجود ہیں لیکن موجود ہونے کی کیفیت،احوال اور معنویت میں بالکل مختلف ہیں۔ایک کا قانونِ حرکت دوسرے پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ایک کا اُسلوبِ ہستی دوسرے میں نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔مغرب کی تمام تر تہذیبی پیش رفت اصل میں اسی نظریے سے پیدا ہوئی۔

اسی طرح جدید مغرب کی تشکیل میں دوسرا بڑا ہاتھ نٹشے کا ہے۔نٹشے وہ آدمی ہے جس نے تمام انسانی حدود و قیود کا انکار کیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے وجود کے اس سانچے ہی کو حقارت سے توڑ دیا جس میں انسان ڈھلتے ہیں۔اگر یہ پوچھا جائے کہ جدید مغرب کی صورت گری میں سب سے بڑا ہاتھ کس کا ہے؟ تو کم از کم میں تو یہی کہوں گا کہ نٹشے کا۔ Post Modernist بھی پچھلے لوگوں میں سے اگر کسی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، یا یوں کہہ لیں اس کی تردید پر مائل نہیں ہیں تو وہ یہی نٹشے ہے۔نٹشے وہ آدمی ہے جس نے اہل جدیدیت اور ارباب مابعد جدیدیت کی طرح انسان کی تشکیل نو کی بات نہیں کی بلکہ وہ

انسان کو اس کی وجودی ساخت ہی میں فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک انسان اس وجودی نقص میں مبتلا ہے جو اصلاح کا نہیں، انہدام کا متقاضی ہے۔ جب تک human conditions کو تمام مظاہر سمیت تہس نہس نہیں کر دیا جاتا، زندگی کی تکمیلی صورتیں پیدا نہیں ہوں گی۔ یہیں سے نفیِ محض کے اس رویے کی بنیاد پڑی جو Post Modernism کی غالباً سب سے بڑی اساس ہے۔

تیسرا مرکزی آدمی ہے مارٹن ہائیڈیگر اس نے واضح لفظوں میں لیکن نہایت پیچیدہ اُسلوب کے ساتھ یہ بتایا کہ انسانی نفس میں سب سے قوی داعیہ، داعیہ بودن نہیں ہے بلکہ داعیۂ نابودن ہے۔ انسان کا سب سے گہرا تجربہ، اس کا سب سے پر کشش حال، اس کی شخصیت کی ساخت میں سب سے ضروری اور مضبوط عنصر، اس کے تمام تصورات کی تشکیل میں سب postmodern-art-21841718 سے زیادہ بامعنی اور کارآمد جوہر اس کی موت ہے، زندگی نہیں۔ آدمی کا سب سے حقیقی، سب سے انفرادی اور سب سے مکمل تجربہ موت کا تجربہ ہے۔ چیزیں اس وقت تک مکمل نہیں ہوتیں جب تک وہ انفرادی نہ ہو جائیں یا انفرادیت کے ساتھ زندہ مناسبت نہ پیدا کر لیں یا انفرادیت کی ملکیت اور حصہ نہ بن جائیں۔ ہائیڈیگر وہ شخص ہے جس نے نفس انسانی کی پیچیدگیوں اور گہرائیوں کو عقلی اور جمالیاتی شعور کے پورے امتزاج کے ساتھ کھولا اور کھنگالا ہے۔ اب تک کی جرمن فلسفیانہ روایت کے برخلاف اس نے حقائق کی تمام سطحوں کو نفس انسانی کے احوال کا حصہ

بنا کر دکھایا ہے۔ حقیقت کی طرف فلسفیانہ پیش قدمی کی پوری روایت میں ہائیڈیگر شاید پہلا فلسفی ہے جس نے نفس اور لفظ کے غیر محدود تجزیے کو حقائق تک رسائی کا بنیادی ذریعہ بنایا۔ ہائیڈیگر علامہ اقبال کا معاصر تھا، ان دونوں کا تقابلی مطالعہ ہمیں خاصے دلچسپ نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ حقائق کی اقلیم میں انسان کو مرکزی منصب پر فائز کر دینے کا رویہ دونوں کے یہاں شدت سے موجود ہے۔ اقبال اس مرکز حقائق انسان کو ایک ایسے تناظر میں دیکھتے ہیں جو اخلاقی Idealism یا مذہبی Romanticism کے عنوان کے تحت لایا جا سکتا ہے، لیکن ہائیڈیگر اپنے دوسرے نامور معاصر برگساں کی طرح اپنی انسان مرکزی کی اکثر بنیادیں نفس انسانی کی شعوری+حیاتیاتی ساخت پر رکھتا ہے۔ گویا اقبال Ideal Man کو actualize کرنا چاہتے ہیں اور ہائیڈیگر actual man کو Idealize کر کے دکھاتا ہے۔

بہر حال ہائیڈیگر کے نزدیک انسان کی اصل قوت اور اس کی حقیقی urge جذبۂ زندگی نہیں بلکہ جذبۂ مرگ ہے۔ سب سے بڑے معنی موت میں ہیں۔ زندگی معنی کا ناکافی ظرف ہے۔ یہ پیالہ ذرا سا بھر کر چھلک جاتا ہے۔ اس چھلکنے کی وجہ ایک تو اس کا چھوٹا ہونا ہے اور دوسرا اس کا متحرک ہونا۔ اور یہ حرکت بھی ایک فضول سے زمانی بہاو کی مرہون منت ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ یہ باتیں جس طرزِ احساس کی تسکین کر سکتی ہیں، ہم غالباً اس کے امیدوار بھی نہیں ہیں۔

ہائیڈیگر نے اس Nihilism کو ایک نفسیاتی بنیاد فراہم کر دی جس میں نٹشے نے ایک مابعد الطبیعیاتی شکوہ پیدا کر دیا تھا۔ نٹشے اظہار میں اور تخیل میں جس شکوہ کا گویا موجد ہے، اس کی وجہ سے انسان اور انسانی دنیا جس احساسِ تحقیر میں مبتلا ہو گئی، انسان کے بارے میں پیدا ہونے والی کسی روایت میں اس کی جھلک بھی نہیں ملتی۔ نٹشے نے فلسفیانہ سطح پر Absurdism کا ایک ایسا مینار کھڑا کر دیا جس کی بلندی معنی کے تمام structures سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ نٹشے کا نا ممکن حد تک پہنچا ہوا خطیبانہ شکوہ Metaphysics پر پڑنے والا سب سے طاقتور گھونسا ہے، لیکن اس میں کارفرما ساری طاقت Metaphysical ہی ہے۔ نٹشے اپنے اہداف کو اس قدر اونچائی پر رکھتا ہے کہ وہ ممکن الحصول نہیں لگتے اور نٹشے کا مقصد بھی یہی تھا۔۔۔ مخاطب کی تحقیر اور اس کے اندر ترسنے کی مستقل کیفیت پیدا کر دینا۔ اس نے بہت کامیابی کے ساتھ ہمیں یہ باور کروا دیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس تجربے میں جھونک دیا کہ اصل معنی یا حقیقت انسانیت کی سمائی سے بالکل باہر ہے۔ انسان اپنے ہی وہم سے بھری ہوئی ایک متحرک پرچھائیں ہے، جو کائناتِ وجود کے کچھ حصوں پر کالک کی طرح منڈھ جاتی ہے۔

ہائیڈیگر نے نٹشے ہی کے چلن پر چلتے ہوئے کمال یہ کیا کہ جذبۂ مرگ کو جیسے محسوس کروا دیا۔۔۔ حس کی سطح پر بھی اوران سطحوں پر بھی جہاں ایسے تصورات بنتے ہیں جن کوآدمی شعور کی مجموعی قوت اور یکسوئی کے ساتھ Idealize کرتا ہے۔ایک پہلو سے دیکھیں تویوں لگتا ہے کہ ہائیڈیگر نے نٹشے کی کچھ باتوں کو زیادہ قابلِ عمل، زیادہ موثر اور زیادہ مانوس بنادیا۔نٹشے نے Nihilism میں جو مجذوبانہ زور پیدا کیا تھا،ہائیڈیگر نے اسے شعور کا بنیادی حال اور حاصل بنادیا۔اس نے گویا ایسا کام کیا کہ نٹشے کا Ideal سکڑ کر قابل عمل بن گیا۔یعنی ایک مناسب سائز میں آکر actualize ہونے کے قابل ہوگیا۔ Postmodernism کے سلسلے میں ایک بہت بنیادی بات یہ ہے کہ اس سے نٹشے کے Ideals یاتو actualize ہوگئے ہیں یااس عمل سے گزر رہے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا حال ہی ہمارا مستقبل بعید ہے۔ایسے لوگ ہمیشہ مستقبل میں ہوتے ہیں۔یہ اگر دوہزار سال قبل مسیح میں بھی پیدا ہوئے ہوں تو بھی ان کی موجودگی ہمارے مستقبل میں ہے۔وجودیوں میں میرا خیال ہے کہ ایسی شخصیت صرف ہائیڈیگر کی ہے۔دوسرے لوگ ہمارا ماضی ہیں۔اس کی Being and Time کسی بھی اعتبار سے فلسفے کی کسی کتاب سے فروتر نہیں۔اس میں مباحث کی اکثریت ایسی ہے جو بالکل original ہے اور جو موضوعات بظاہر روایتی ہیں انھیں بھی دیکھنے کا تناظر یکسر نیا ہے اوران کی logicization بھی ایسی ہے جو ہائیڈیگر سے پہلے موجود نہ تھی۔

یعنی اس نے یا تو نئی چیز بنا کر دکھائی ہے یا پھر پرانی چیز پر پڑے ہوئے تمام ہاتھ ہٹا کر اس کو اپنے قبضے میں لیا ہے۔ یہ ایسا آدمی تھا جس نے شعور انسانی کے تمام اجزا کو ایک ماورائے عقل جمالیاتی حس و شعور کے ساتھ نہایت پختگی، کمال اور گہرائی کے ساتھ قایم کیا۔ ہم میں سے بہت سے لوگ شاید اس بات سے بھی خوش ہو جائیں کہ ہائیڈیگر نے شاعر کو فلسفی پر غالب کیا ہے یعنی افلاطون سے ہمارا بدلہ لے لیا۔

ان تین کے بعد کئی لوگ آئے جنھوں نے Post Modernism کی اصطلاح کو ایک فکری پیرائے میں استعمال کیا۔ Architecture ، موسیقی، سینما وغیرہ سے ہوتا ہوا یہ لفظ ادب میں آیا اور پھر وہیں اس کے تھیوری بننے کے مراحل شروع ہوئے۔ فلسفے میں ابھی اس کا کوئی بڑا نمونہ سامنے نہیں آیا۔ اس کے تصورات کو فلسفیانہ تعریفات کے دائرے سے فی الحال دور ہی رکھنا چاہیے۔ یوں اس کی فلسفیانہ بنیادیں بتائی تو جاتی ہیں لیکن وہ سب اس کی پیدائش سے پہلے کی ہیں۔

چونکہ ہمیں اس کی تاریخ بیان نہیں کرنی اس لیے مناسب یہی ہے کہ ترتیب کا بہت زیادہ لحاظ رکھے بغیر اس کے اہم ترین اجزا کو کہیں اختصار اور کہیں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ کوشش یہی ہو گی کہ کوئی ضروری بات نظر انداز نہ ہو، باقی رہا مصنفین اور کتابوں

کا تذکرہ تو وہ یہاں ہمارا مقصود نہیں ہے۔ ممکن ہے کچھ اہم نام رہ جائیں لیکن اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑے گا کیونکہ بنیادی مباحث بہر حال اس گفتگو میں آجائیں گے۔

مابعد جدیدیت کا مجموعی فہم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی دعوے کو سمجھا جائے۔ وہ دعویٰ یہ ہے کہ حقیقت وغیرہ کا کوئی بھی بیان آفاقی و ابدی، ہمہ گیر و مستقل اور عمومی و واجب التسلیم نہیں ہو سکتا۔ یہاں دو باتوں کا خیال رہے کہ اہل ما بعد جدیدیت کے نزدیک کل وجود بیان محض ہے۔ جسے ہم حقیقت کہتے ہیں وہ بھی فقط ایک بیان ہے جس میں اصطلاحات وجودی استعمال ہوئی ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ بیان جسے وہ بیانیہ Narrative کہتے ہیں، تصور اور تصدیق کی منطق سے بے نیاز ہوتا ہے لہٰذا اس میں جاننے یا ماننے کا مطالبہ داخل کرنا لغو اور بے معنی ہے۔ اس پس منظر میں دیکھیے تو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ حقائق وغیرہ ایک خاص شعور کے تصورات ہیں جن میں عموم اور ہمیشگی کا گذر ہو ہی نہیں سکتا۔ عمومی اور مستقل بیان کو Grand یا Meta Narrative کہا جاتا ہے اور اس سے مراد وہ تصور ہوتا ہے جس سے واقعی اور حقیقی دنیا پر زبردستی کوئی تعبیر تھوپی جائے اور یہ طے کر دیا جائے کہ فلاں چیز یہ ہے اور اس کا مقصد و حقیقت یہ ہے۔ یعنی حقیقت بھی کوئی چیز ہوتی ہے جو خود چیز کے علاوہ ہوتی ہے، ان لوگوں کی نظر میں یہ ایک چالاکی ہے جس کے ذریعے سے آدمی چیزوں پر غالب اور متصرف ہونے کا راستہ نکالتا ہے۔ بقول سوشیور حقیقت وغیرہ کچھ نہیں ہے، بس ایک

زاویۂ نگاہ ہے۔ میں چیز کو جس زاویے سے دیکھتا ہوں، اس کی حقیقت بدل جاتی ہے مگر چیز وہی رہتی ہے۔

Grand Narrative نے ہمیں جس دھوکے میں رکھا ہوا ہے، اس سے نکلے بغیر ہم انسان اور دنیا کے تعلق کے حقیقی دروبست اور واقعی مطالبات تک نہیں پہنچ سکتے۔ تمام چیزیں، تمام سچائیاں چھوٹے چھوٹے وقتی پیمانوں پر ہیں اور ایک سادہ سے خارجی حضور (presence) سے عبارت ہیں۔ Grand Narratives کی حاکمیت نے ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے صرف علمی نقصان ہی نہیں پہنچایا بلکہ ان کا ضرر سیاسی اور سماجی بھی ہے۔ ان سے جبریت، عدمِ مساوات، مطلق العنانی اور ظلم نے جنم لیا ہے۔ اسی لیے اکثر Post Modernist سوسائٹی اور اسٹیٹ کے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سماجی نظام ہے، سوشل اسٹرکچر ہے۔ معاشرہ چونکہ اقدار پر قائم ہوتا ہے اور اقدار میں عموم اور استقلال کم از کم تصور کی سطح پر لازم ہے، اس لیے یہ لوگ معاشرے کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں اقدار بھی Grand Narratives ہیں۔ ان کے خیال میں معاشرہ ایسی وسعت کا حامل ہونا چاہیے جس میں اختلاف اور تصادم کی گنجائش موجود ہو۔ البتہ jorges pineda painting childscribble چیزوں کا ایک عملی مصرف ہے، اس میں نہ کوئی اختلاف ہوتا ہے اور نہ ہونا چاہیے۔ مثلاً میرے اور آپ کے عقیدے میں فرق ہے تو پانی

پینے کے مسئلے پر ہمارا کوئی اختلاف نہیں، میری اور آپ کی رائے میں تصادم ہے تو بہر حال بس پر سوار ہونے میں ہم آپس میں متفق ہیں۔ اسی اتفاق سے ہمارے درمیان ایک نظام تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت اور پرداخت کرنی چاہیے۔ باقی آپ کی رائے صحیح ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور میری رائے غلط ہے تو اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لیوتار (Leyotard) کہتا ہے۔ بظاہر یہ بھی ایک Grand Narrrative ہی ہے جس نے مابعد جدیدیت کی تشکیل میں بہت بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کی کتاب کی بسم اللہ ہی یہ ہے کہ سچائیاں چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، مقامی ہوتی ہیں اور وقتی ہوتی ہیں۔ ان کو ان کی اپنی شرائط کے ساتھ تسلیم کرنا ہوگا اور ان کے ساتھ اپنے وقتی تعلق کو تہ دل سے ماننا ہوگا اور اپنی زندگی کے انداز کو خیالات کی بجائے اسی living presence سے ہم آہنگ رکھنا ہوگا۔ اس کے بعد انسان کے لیے وہ مسائل پیدا نہیں ہوں گے جو اس پر مصیبتیں لاتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کو نظریے کے لحاظ سے Theory of Derealization بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ Post Modernism پر نٹشے کس حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ انسان اور دنیا کے باہمی تعلق سے پیدا ہونے والے ہر تصور اور ہر واقعیت کو مکمل طور پر رد یا نظر انداز یا مسمار کیے بغیر اس انسان اور اس دنیا کو وجود نہیں مل سکتا جن پر Postmodern Condition کا قیام ہے۔ لیوتار

نے کہیں کہا ہے کہ آخری Grand Narrative مارکس نے وضع کیا۔اس کے نظریے پر مبنی جو سوسائٹی متشکل ہوئی یا جو State Structure وجود میں آیا وہ اپنی اساس میں اتنا ہی مجرد تھا جتنا کہ وہ تمام اجتماعی نظام تھے جن کی تردید پر مارکسی تھیوری کا دارومدار ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تھیوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والا نظام بھی جبر کی شدت میں انھی نظاموں کی طرح تھا جن سے لڑنے کے لیے مارکس کھڑا ہوا تھا۔لیوتار کا یہ فقرہ بہت مشہور ہوا کہ اگر مارکس غلط ہو سکتا ہے تو سب کچھ غلط ہو سکتا ہے۔

یہاں سلسلہ کلام کو ذرا دیر کے لیے معطل کرنا ہوگا کیونکہ یہ دریدا کے ذکر کا بہت مناسب موقع ہے۔ ژاک دریدا وہ آدمی ہے جس نے Post modernism کو ایک Literary Theory بننے میں کامیابی دلوائی اس تھیوری کا نام ہے Deconstruction Theory یعنی ردِ تشکیل کا نظریہ۔

Deconstruction کیا ہے؟ لفظ میں مفروضہ Meaning structure اور ذہن میں موجود Meaning Form کو ختم کر دو۔یعنی لفظ میں پہلے سے موجود معانی کو لفظ سے خارج کرو، دماغ میں پہلے سے راسخ تصورات کو مٹاؤ۔۔۔اس کے بعد ہی تم منتہائے اظہار اور منتہائے ادراک کو یکجان کر سکتے ہو۔انسانی شعور کی سب سے بڑی تمنا دریدا کے نزدیک یہ ہے کہ غایتِ ادراک اور غایتِ اظہار ایک ہو جائے۔وہ کہتا ہے کہ لفظ کے معانی ذہن میں موجود معانی سے زیادہ ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے معانی انسانی ذہن کی

پکڑ میں نہیں آسکتے۔ حتیٰ کہ منشاے متکلم کا بھی اس سلسلے میں کوئی کردار نہیں کیونکہ متکلم کا انحصار بھی ذہن میں موجود معانی پر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے فلسفے یا نظریے کو التواے معنی کا فلسفہ یا نظریہ کہتا ہے۔ یعنی معانی ہمیشہ ملتوی ہوتے رہتے ہیں اور جو کچھ ہماری تحویل میں آتا ہے وہ معنی نہیں ہے بلکہ معنویت کا ایک جزو ہے۔ وہ معنی اور معنویت (Meaning and Meaningfullness) میں فرق کرتا ہے۔ شے کے معنی گرفت میں نہیں آسکتے، اسے اپنے شعور کے لیے مفید استعمال بنانے کی خاطر شعور شے سے کچھ معانی منسوب کر دیتا ہے۔ یہی معنویت ہے یعنی معنی کا احتمال جو حصول معنی کو ایک بعید از رسائی مقصود کے طور پر زندہ رکھتا ہے اور شعور کو اس کی طرف یکسو رہنے میں مدد دیتا ہے۔ معنویت اجتماعی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے۔ چیزیں اپنا اظہار کر کے اپنے معنی کو مکمل یا متعین یا ظاہر نہیں کرتیں بلکہ انھیں ملتوی کرتی چلی جاتی ہیں۔ تھیوری کی سطح پر اگر Postmodernism کے پاس کچھ ہے تو وہ یہی Deconstruction Theory ہے یا پھر Feminism کو بھی Postmodern Theory کہا جاتا ہے۔

سر دست مابعد جدیدیت کے پاس یہی دو theories ہیں۔ Feminism کی صورت یہ ہے کہ حقوق نسواں یا خواتین کے سماجی مرتبے کا تصور بہت قدیم سے چلا آرہا ہے، اس تھیوری میں اس تصور کا کوئی بڑا کردار نہیں ہے۔ اس باب میں مابعد جدیدیت کا

تناظر بالکل الگ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں حقائق کو حقائق کہنے کے جو دلائل بنائے گئے ہیں وہ سب مردانہ ہیں۔ یعنی جس چیز کو کوئی نام دیا گیا ہے یا کوئی معنی دیے گئے ہیں وہ تمام اسما و معانی مردانہ ذہن اور اختیار کی پیداوار ہیں۔ ہم نے دنیا کو، چیزوں کو حتیٰ کہ خود انسانیت کو عورتوں کی نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ اسی وجہ سے شعور کی نسائی ساخت ہمیشہ سے معطل چلی آرہی ہے۔ صرف سیاسی اور تہذیبی معنوں میں نہیں بلکہ یہ ایک کلی تھیوری ہے۔ اب تو اس کے نام سے باقاعدہ ایک مکتب تنقید وجود میں آچکا ہے جس کا نام ہی Gynae Criticism ہے۔ اس کا ہدف یہ ہے کہ عورتیں اپنے شعور کی ساخت سے وفادار رہتے ہوئے پورے نظامِ معنی کو نئے سرے سے ترتیب دیں اور اس کے اظہار کے نسائی زاویے اور سانچے بنائیں۔

Postmodernism یا Postmodernity پر گفتگو کرتے ہوئے دو چیزوں کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے، ایک اس کی تھیوری اور دوسرے اس کے تخلیقی مظاہر۔ اگر آپ کو تھیٹر کی تاریخ سے دلچسپی ہو تو بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک بہت بڑی تحریک چلی تھی جس نے شیکسپیئر کے بعد سب سے بڑے ڈراما نگار پیدا کیے۔ بلکہ میری رائے میں ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے شاید شیکسپیئر کو چھو لیا تھا۔ میری مراد Theater of the Absurd یا Absurd Theater کی تحریک سے ہے۔ اس تحریک نے واقعۃً ڈراما نگاری کی پوری روایت کو منقلب کر دینے

والے لوگ پیدا کیے، مثلاً Samuel Beckett ، Eugene Ionesco وغیرہ۔ یہ دونوں خاص طور پر بعض اعتبارات سے شیکسپیئر کو بھی پیچھے چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر Waiting for Godot کا مرکزی کردار اپنی الجھنوں میں Hamlet سے بلکہ شیکسپیئر کے کسی بھی کردار سے زیادہ وسعت، گہرائی اور معنی خیزی رکھتا ہے۔ Absurd ڈرامے ظاہر ہے سمجھ میں آنے کے لیے نہیں لکھے گئے تھے لیکن ان کو نہ سمجھ سکنے کی حالت بھی اتنی کیفیت انگیز اور معنی خیز ہے کہ آدمی اپنے دستیاب طرز احساس اور اُسلوبِ ادراک سے اسے سہار نہیں سکتا۔ دیکھیے نٹشے یہاں بھی موجود ہے۔ یہ ایک عجیب چیز ہے جس کا ہمیں تجزیہ کرنا چاہیے کہ کوئی چیز بالکل سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس کے باوجود ہم اسے عظمت کے آخری درجے پر کیوں رکھتے ہیں۔ یہ کوئی ہمارے اندر ذوق کا اصول کار فرما ہے جو فہم کو ناگریز نہیں رہنے دیتا؟ بہر حال چیزوں سے ذہنی کے ساتھ ایک ذوقی تعلق بھی ہوتا ہے اور ذوق کی تسکین بعض مرتبہ فہم کو نظر انداز کر کے بھی ہو جاتی ہے۔

مابعد جدیدیت میں چاہے اس بات پر کچھ اختلاف ہو لیکن مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ Postmodernism کے ادبی اثاثے کا سب سے قیمتی حصہ Absurd Plays ہی ہیں۔ Absurd دراصل وہ حقیقت یا معنی ہے جو انسانی ذہن کی گنجائش سے زیادہ ہے۔ Absurd Theater نہ ہوتا تو دریدا اپنے بنیادی نظریہ التوائے

معنی تک شاید نہ پہنچ سکتا۔Waiting for Godot نہ ہوتے تو دریدا یہ شہرۂ آفاق فقرہ شاید نہ کہہ سکتا،

Meanings are beyond presence

مختصر یہ کہ Postmodern Theory میں Deconstruction ، Post Structuralism، Gender Crisis، Gynae Criticism وغیرہ شامل ہیں۔۔۔جب کہ اس کا دوسرا رخ Postmodern Condition ہے۔یعنی یہ ایک تھیوری بھی ہے اور ایک صورت حال بھی۔اکثر لوگوں کا زور اس کے تھیوری نہ ہونے پر ہے، کیونکہ تھیوری بنتے ہی یہ خود ایک Meta Narrative بن جائے گا۔ان کا زیادہ اصرار یہ ہے کہ Postmodern Condition کو سمجھا جائے یعنی اس presence تک محدود رہا جائے جس کو Postmodern کہا جارہا ہے۔ویسے ایک رخ سے یہ بات خاصا وزن رکھتی ہے۔اگر ذرا سا غور سے دیکھا جائے تو بالکل واضح طور پر احساس ہو جائے گا کہ یہ ایک نئی صورت حال ہے اور اس کی معنویت کو جاننے کے لیے کچھ نئے اسالیبِ فہم درکار ہیں۔

مابعد جدیدیت کا ایک سادہ سا ایجنڈا بھی ہے جو ہم ایسے عوام الناس کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں،

۱) (صرف ایک چیز ایسی ہے جس پر کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا اور وہ چیز ہے انسان کی آزادی۔ انسانی آزادی کا تصور اور اس کی اطلاقی صورتوں پر کوئی سمجھوتا نہیں ہو گا۔ اس آزادی کو سلب کر لینے والا سب سے بڑا ذریعہ انسانی شعور کا اعتقادی (Doctrinal) حصہ ہے۔ یعنی جب شعور کسی چیز کو مستقل مان لیتا ہے اور اپنے ماضی کے عمل سے اپنی موجودہ صورت حال کو ردّ و قبول کرنے کا عادی بن جاتا ہے تو یہ انسانی آزادی کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ہم انسانی ذہن کی اعتقادی حالت کو بدل کر رہیں گے۔ اعتقاد (Doctrine) سے ان کی مراد ہے کسی بھی طرح کا متعین نظام اور کسی بھی طرح کی کوئی ایسی فکر جو انسان کی تمام سرگرمیوں کو اپنے قبضے میں کر لے، جیسے مارکسزم یا کوئی بھی مذہب۔ عقاید یا عقیدے جیسا تحکم رکھنے والے نظریات انسان کی وجودی پرواز کا رخ اپنی طرف کر لیتے ہیں۔ آزادی کی اس سے بڑی نفی ممکن نہیں۔

۲) (ہمیں انسان کی سمجھ میں اضافہ نہیں کرنا۔ ہم انسان کے شعور کو چیزوں کا جمالیاتی احیا اور اعادہ کرنے والی قوت بنانا چاہتے ہیں۔ اسی سے وہ سادہ، خالص اور حقیقی

presence شعور کی پوری پوزیشن کو بدل دینے والی طغیانی کی طرح تجربے میں آئے گی۔

۳) (منشاے متکلم کوئی چیز نہیں۔ قاری متن سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہی متن کی حقیقت ہے۔

مغرب کی وہ تحریکیں جنھوں نے اس کی علمی و تہذیبی تاسیس کی ہے، ان سے واقفیت پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ مغرب کی تشکیل اور ردِّ تشکیل کے چند مراحل میں۔۔۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جب عیسائیت کو Romanize کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں مغرب نے اپنی بعض بنیادی علمی اور تہذیبی اقدار حاصل کیں۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے نشاۃ ثانیہ کا۔ عیسائیت کی Romanization نے مغرب کی جو علمی اور تہذیبی تشکیل کی تھی، اس مرحلے پر ان تشکیلات کو خاصی حد تک مسترد کیا گیا۔ اس صورت حال میں مغرب نے اپنی ردِّ تشکیل کا ڈول ڈالا، علمی بنیادوں پر بھی اور تہذیبی بنیادوں پر بھی۔ اس کے بعد تیسرا اہم ترین مرحلہ ہے، جدیدیت۔ جدیدیت کا وہ مطلب نہیں ہے جو عام طور پر ہم لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ دراصل Enlightenment Project تھا۔ جدیدیت گویا نشاۃ ثانیہ کی تکمیل بھی ہے اور تجدید بھی۔ جدیدیت کا المیہ یہ ہے کہ

مابعدالطبیعیات یازیادہ صحیح لفظوں میں مذہبی وروایتی مابعدالطبیعیات کاانکار کردینے کے باوجود اس کا اپنا انداز نظر وہی تھاجو مابعدالطبیعی حقائق کو ماننے سے پیدا ہوتا ہے۔ جدیدیت حقیقت کی واحد تعریف سے بغاوت کا نتیجہ تھی۔اس کے نزدیک ایسی کوئی تعریف جو کل پر صادق آئے اور تغیر کے امکان سے پاک ہو، ممکن نہیں۔اس کی نظر میں یہ قابل عمل بھی نہیں ہے اور سائنس وغیرہ کی ترقی سے علمی استدلال اور مشاہداتی استناد میں جو تبدیلی آئی ہے، یہ تصور اس کے مطابق بھی نہیں ہے۔ یہیں سے Enlightenment Project کے نام سے ایک ایسا خیال سامنے آیا جسے Modernism کہتے ہیں اور Modernity بھی۔اس خیال کا مقصود یہ تھا کہ انسان چیزوں کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ وہ انھیں ذریعہ بناکر کسی مفروضہ حقیقت تک پہنچ جائے گا۔روایتی انسان شے کو صورت و معنی اور حقیقت و مظاہر جیسے متوازی تضادات میں دیکھنے کا عادی تھا۔اہل جدیدیت کے نزدیک ان متقابلات میں محبوس ہو کر شعور حقیقت کو تو کیا پاتا خود شے سے بھی دور ہو گیا۔چیزوں میں کئی ایسے امکانات بر سر عمل ہوتے ہیں جو اس انداز نظر کے جبر کی وجہ سے اوجھل ہو کر رہ گئے۔چیزوں کو ان کے خالص پن اور ان کی ساخت میں کارفرما پیچیدگی اور تہ داری کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔یہیں سے وہ علمی اور تہذیبی فیصلے وجود میں آئیں گے جو دنیا کو ہر معنی میں انسانی بنادیں گے۔یہ مغرب کی تشکیل نو تھی۔مگر اس کو بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا پڑا۔

مارکس کی مقبولیت کا پھیلاو، پہلی جنگ عظیم اور پھر دوسری جنگ عظیم کے آثار کی نمود۔۔۔ان تین تاریخی مظاہر کو بیک وقت نظر میں رکھنا چاہیے۔ پہلی جنگ عظیم میں مغربی تہذیب کی نظریاتی بناوٹ کمزور پڑی، مارکس کی آمد اور مقبولیت نے مغربی تہذیب کی بنیادی ترین ساختوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔۔۔یعنی مارکس وہ آدمی تھا جس نے مغرب کے اُسلوبِ حیات کو الف سے یا تک تبدیل کر دیا۔۔۔ یہ خطرے کی دوسری گھنٹی تھی جو مغرب جدید نے سنی۔ پھر جب دوسری جنگ عظیم ابتدائی مراحل میں تھی اور نظریاتی شکل بھی اختیار کرتی چلی جارہی تھی، یعنی قوم پرستی، اس وقت کچھ لوگوں کو یہ خیال آیا کہ جدیدیت کوئی منزل نہیں بلکہ محض ایک راستہ تھا جس نے ہمیں تباہی کے صحرا میں لا پہنچایا۔ ہم نے چیزوں کو ان کو اپنی اپنی حد میں رکھتے ہوئے اپنے اعمال کا ایک پورا نظام ترتیب دیا، لیکن اس کا بس یہ نتیجہ نکلا کہ اب ہمارے ہاں ایسی خود کش صورت حال پیدا ہو رہی ہے، اور کوئی ایسا نکتہ بھی ہمارے پاس نہیں رہا جو ہمیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہونے سے روک سکے۔ مابعد جدیدیت دراصل وہی نقطہ ہے جو جدیدیت کے ناکام ہو جانے کے بعد مغرب کو میسر آیا۔اس لیے Postmodernism کا سیدھا مطلب یہ ہے، ”جدیدیت کے بعد پیدا ہونے والا نظریہ یا صورت حال۔ “

اس نظریے نے جدیدیت کو جن بنیادوں پر چیلنج کیا، وہ بنیادیں بہت گہری ہیں۔ یہ انسانی تشخص کو تمام موجود حدود، تعریفات اور اصطلاحات سے آزاد کروانے کے موقف پر

استوار ہے۔اس نظریے کی رو سے انسان وہ وجود ہے جسے اپنے موجود ہونے کے کسی بھی حصے میں باہر سے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ایسا خود منحصر تشخص شاید پہلی مرتبہ بیان میں آیا ہے۔تاریخ فکر میں تمام بڑے بڑے خیالات، تمام بڑے بڑے فلسفے اپنے آپ کو با ضابطہ خیال یا باقاعدہ فلسفہ کہلوانے کے لیے سب سے پہلے ایک سوال کا جواب دیتے ہیں، تمھارا تصور انسان کیا ہے؟ Postmodernism اس امتحان پر پورا اترتا ہے۔اس کے پاس باقاعدہ ایک تصورِ انسان ہے جو اجنبی ہونے کے باوجود کم از کم زندگی کے اضطراری شعور کی تائید ضرور کرتا ہے۔ایک Postmodernist یہ کہہ سکتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کا تصور انسان بالکل نیا ہے بلکہ اس تصور میں وہ طاقت۔ور واقعیت بھی پوری طرح کارفرما ہے جس کے بل پر تمام روایتی تصوراتِ انسان کو رد کیا جا سکتا ہے۔

جدیدیت نے حقیقت محض کا انکار تو کیا تھا لیکن اس کے منطقی جواز کو چیلنج نہیں کیا تھا بلکہ اسے شعور کی بعض سرگرمیوں میں دخیل بھی رہنے دیا تھا۔ Postmodrnism میں حقیقت محض وہ تصور ہے جس نے شعور کی اس ساخت میں جنم لیا تھا جو حقیقی نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے فنا ہو چکی ہے۔ حقیقت کا تصور جس دماغ میں پیدا ہوتا تھا وہ دماغ اب آثار قدیمہ کا حصہ ہے، لہٰذا یہ بات مہمل سے بھی مہمل ہے کہ فلاں چیز کی یہ حقیقت ہے، اس حقیقت کی یہ دلیل ہے اور اسے ماننے کا یہ فائدہ ہے۔ یہ ساری سکیم، یہ ساری ترتیب انسان کی کئی صدیاں ضائع کر کے بالآخر اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔اس مبحث میں

پوسٹ ماڈرنسٹوں کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ حقیقت کو خواب اور تصور کے طور پر بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ان کی نگاہ میں حقیقت موہومِ محض ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ان کی ایک بنیادی اصطلاح ڈسکورس (discourse) ہے۔اس کا مطلب ہے کہ ہر چیز محض presence ہے۔یعنی ہر چیز ظاہر ہی ظاہر ہے،اور اس ظاہر کی بناوٹ اسی طرح کی ہے جیسے کتاب میں الفاظ کی ہوتی ہے تو ہمارے اور چیزوں کے درمیان اور ہمارے آپس کے تعلق کی اصلیت فقط اتنی ہے جتنی کتاب اور قاری کے درمیان ہوتی ہے۔اس کو وہ بین المتنیت (Intrtextuality) کہتے ہیں۔ بین المتنیت ادب میں دوسرے معنوں میں ہے لیکن اپنے دیگر اطلاقات میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ڈسکورس کے اجزا آپس میں اس طرح متعلق ہوتے ہیں جیسے ایک متن دوسرے متن سے۔ جب تک ہم تعلق کی اس سطح کو دریافت نہیں کریں گے، ہم نہ صرف یہ کہ اپنی آزادی کا شعور قایم نہیں کر پائیں گے بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کی آزادی کو ملحوظ اور محفوظ رکھنے کا ذریعہ بھی نہیں بن سکیں گے۔ اسی لیے ان لوگوں کے نزدیک دو چیزوں میں اختلاف ان کے تعلق ہی کی ایک نوع ہے۔اس پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

جدیدیت انسانی شعور کی کچھ عمومی بنیادوں کی قائل تھی لیکن Postmodernism کے خیال میں شعور انسانی کو کسی بنیاد پر قایم رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تصور ہی بے معنی ہے کہ چیزوں کو دیکھنے کا ایک بے لچک یا مستقل

زاویہ تلاش کیا جائے۔ انسانی شعور اس کے لیے بنا ہی نہیں۔ انسانوں نے زبان کی ایجاد کے بعد لفظ سے مغلوب ہو کر اپنے شعور کو اس وہم میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ہم شے کو دیکھنے اور جاننے کا ایک مستقل تناظر پیدا کر سکتے ہیں۔ لفظوں کی فتح قبول کر لینے کی وجہ سے شعور انسانی ایک ہمہ گیر بگاڑ میں مبتلا چلا آرہا تھا جس کو اپنی دانست میں ان لوگوں نے ٹھیک کر دیا ہے۔ اس موضوع پر پوری بات جاننے کے لیے ژاک دریدا کی Of Grammatology کو محنت اور غور سے پڑھنا چاہیے۔ یہ اتنی اہم کتاب ہے کہ جس نے یہ کتاب نہیں پڑھی وہ بہت کچھ پڑھنے کے باوجود بہت پڑھا لکھا نہیں ہے۔ دریدا معنی کو موجود ہی نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ ہم کسی متن کے ساتھ اپنی موجودہ ذہنی یا نفسی ضروریات کے تحت ایک تعلق سا پیدا کر لیتے ہیں اور اس سے کچھ مطلوب معانی منسوب کر دیتے ہیں۔ اس عمل سے دراصل ہم متن کا مطالبہ پورا کرتے ہیں اور پھر جب شعور کی ضرورت بدل جاتی ہے تو پھر وہی متن ہم سے کچھ اور معانی کا تقاضا کرتا ہے اور اس کو بھی ہم اسی طرح پورے وثوق سے قبول کر لیتے ہیں۔

دریدا نے مطالعۂ متن کے فلسفے کو شروع نہیں کیا ہے بلکہ آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ مابعد جدیدیت کے تناظر میں اس تھیوری کا بانی رولاں بارتھ (Roland Barthes) تھا۔ اس کا مشہور فقرہ ہے، ”تحریر خود کو لکھتی ہے، مصنف نہیں۔“ یعنی تحریر ایک ڈسکورس ہے، مصنف اس کے وجود میں آنے کا صرف ایک سبب ہے۔ یہ ایسی بات ہے

جسے صرف ادبی رنگ میں سمجھا جاسکتا ہے، منطقی رنگ میں نہیں۔اس ڈسکورس کے وجود میں آنے کے دیگر اسباب اسے پڑھنے والے فراہم کریں گے۔یعنی ایک تخلیق وجود میں آنے کے پہلے مرحلے سے اس وقت گزرتی ہے جب لکھنے والا اسے لکھتا ہے۔دوسرا مرحلہ اس وقت طے ہوتا ہے جب پڑھنے والا اسے پڑھتا ہے اور معنی یابی اور معنی رسانی کے تعامل سے اس کتاب کو سمجھنے کی سرگرمی شروع کرتا ہے۔رولاں بارتھ کے نزدیک یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ تخلیق متن میں زیادہ بڑا کردار مصنف کا ہوتا ہے یا قاری کا۔اسی بات کو دریدا نے التوائے معنی کا فلسفہ بنادیا۔کسی اظہار کا کوئی حتمی، واحد اور binding مفہوم نہیں ہوسکتا کیونکہ متن صرف فہم کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ قاری کی معلوم یا نا معلوم خلاقی کو ابھارتا ہے۔رولاں بارتھ کا مطلب یہ تھا کہ کتاب کی تخلیق کا عمل اس کے طبع ہو جانے سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ پڑھے جانے سے اپنی تکمیل کا سامان کرتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ کوئی پوسٹ ماڈرنسٹ یہ نہیں مانتا کہ مصنف کا کوئی مقصد ہوتا ہے یا مصنف کوئی بات کہنا چاہتا ہے۔مصنف کچھ کہنا نہیں چاہتا، وہ تو بس ایک فعال وسیلۂ اظہار ہے۔وہ خود اپنی تحریر کا مطلب نہ بتا سکتا ہے نہ معین کر سکتا ہے اور نہ اسے اس کا حق ہے۔تحریر مکمل ہوتے ہی مصنف کی حیثیت بھی قاری کی رہ جاتی ہے، اور متن سے برآمد ہونے والی اقلیم معنی کی حکومت ہر قاری کو حاصل ہے، اس میں دوسرے سے کمک لینا بے معنی ہے۔

قاری کی آزادی کا نظریہ اتنا پھیل چکا ہے کہ اس کو ٹھیٹھ طبیعی اور تجربی علوم پر بھی وارد کر دیا گیا ہے۔ سائنسی نظریات یا ثابت شدہ امور اور تجربی و حسّی حدود کی یہاں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ سب ارادی ہیں۔ یعنی سائنس جو چیز جس انداز میں دریافت کرنا چاہتی ہے، اسی انداز میں دریافت کر لیتی ہے۔ معاشرے کو Organization کی طرح بنا دینے والی جدیدیت اس طرح کی چیزوں میں ایک جبری اور مفاد پرستانہ اتفاق کی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس سائنس کے طریقہ کار کو عمل میں لانے والے وسائل ہوں اور اگر اس کا ارادہ اور خواہش کچھ اور ہو تو انھی چیزوں کو کچھ اور ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اس کو پوسٹ ماڈرنسٹوں کی کامیابی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے چیزوں کی conceptual properties کو بدل دیا ہے۔ جس طرح اشیا ہمارے دماغ میں آتی ہیں، ان کے آنے کے مزاج کو تبدیل کر دیا ہے۔ چیزیں جس طرح ہمارے احساسات میں آتی ہیں، ان کے محسوس ہونے کے اُسلوب اور کیفیت کو بدل دیا ہے۔ ٹیری ایگلٹن جو خود ممتاز پوسٹ ماڈرنسٹ تھا، اسی سے بدک گیا۔ اس نے کہا یہ تو مجھے خود کشی پر اکسا رہے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ میں پورے کا پورا خود کو مار کر پھر دوبارہ ان کے ہاتھوں سے اپنی تعمیر نو قبول کر لوں۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی شاید مفید ہوگا کہ پوسٹ ماڈرنزم کو شروع سے آج تک میدان خالی نہیں ملا۔ ایسا نہیں ہے کہ نشاۃ ثانیہ کی طرح آئے اور چھا گئے۔ انھیں علم اور تہذیب کی بڑی بڑی قوتوں کی مخالفت کا سامنا رہا ہے مثلاً آج کل ہیبرماس ہے جو خود کو ماڈرنسٹ اور مارکسسٹ کہتا ہے۔ دریدا کے ساتھ اس کی بحثیں معروف ہیں۔ یہ وہ آدمی ہے جس نے آج تک پوسٹ ماڈرنسٹوں کو یہ دعویٰ کرنے کی اجازت نہیں دی کہ وہ مغرب کے واحد نمائندے ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ مابعد جدیدیت بھی دراصل جدیدیت ہی ہے جو اناڑی لوگوں کے ہاتھ میں آکر اس حال کو پہنچ گئی ہے۔

یہ بات اس لحاظ سے درست لگتی ہے کہ Enlightenment Project جو نشاۃ ثانیہ سے شروع ہو کر مختلف تہذیبی، مذہبی، سیاسی اور فکری تحریکوں میں سرایت کیے ہوئے بالآخر سرمایہ داری نظام اور جمہوریت پر منتج ہوا، اس کی اندرونی بناوٹ اور اس کے وجود میں آنے کے اسباب مابعد جدیدیت سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ جدیدیت کے مقاصد بھی اپنی منطق اور طریق کار میں مختلف ہونے کے باوجود بڑی حد تک مابعد جدیدیت سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں ایک بنیادی فرق یقیناً ہے۔۔۔ اور وہ یہ ہے کہ جدیدیت معروضیت (Objectivity) یا

ایک طے شدہ معروضیت پر زور دیتی ہے جب کہ مابعد جدیدیت چیزوں کو ایک مجرد داخلیت میں سمو دیتی ہے۔ یہ داخلیت لگتا ہے کہ ایک کونیاتی یا وجودی اصول ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر بھی یہ انسانی داخلیت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اس اصول داخلیت کا ایک فعال مظہر ہے۔ اس فرق کا بھی اگر دور تک تجزیہ کیا جائے تو اس میں سے نکلتا کچھ نہیں ہے۔ جدیدیت کی معروضیت بھی کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ اس کے ذریعے سے دنیا کو انسان مرکز بنایا جا سکتا ہے جو جدیدیت کا مقصدِ اعلیٰ ہے۔ ورنہ اصل میں یہ بھی ایک طرح کی داخلیت ہی ہے جس کی بدولت انسان کا تصورِ شے نفسِ شے پر غالب آگیا بلکہ اس پر حاکم ہو گیا۔ لیکن بہر حال مابعد جدیدیت کا یہ امتیاز ضرور ہے کہ اس نے جدیدیت کی اساس یعنی انسان مرکزی کو ہمیشہ کے لیے فراموش کرنے کا سامان پیدا کر دیا اور چیزوں کو ان کی تعریفات (Definitions) کی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ مابعد جدیدیت اس پہلو سے جدیدیت کی ناکامی کی سب سے بڑی دستاویز ہے۔ اس کی وجہ سے اہل جدیدیت کو ان تمام نیم کلاسیکی عناصر سے لاتعلق ہونا پڑا جن کا جدیدیت کی تعمیر میں بڑا حصہ تھا۔ مثلاً کلیہ سازی، نظام بندی، تجربیت وغیرہ۔

اب اگر ہم اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق پوسٹ ماڈرنزم پر کوئی تنقید تیار کرنے چلیں تو میرے خیال میں سب سے پہلے ان کے تصور زبان کا جائزہ لینا ہو گا۔ اسی کے ضمن میں انسان کے شعور اور استعدادِ علم کے بارے میں ان کے نظریات کو بہت غور سے دیکھنا

ہو گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ پوسٹ ماڈرنزم لایعنیت (Absurdism) اور منطقی ایجابیت (Logical Positivism) کا ملغوبہ ہے۔ اس پر کوئی جرح کارگر نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اس کے نظری حدود کے ساتھ ساتھ اس کے جمالیاتی اساسیات اور اس کے پیدا کردہ حالات واحوال کو رد کرنے کی قوت نہ حاصل ہو۔ یہ بالکل چھپکلی کی طرح ہے، اس کا نظریہ اس کی دم ہے، جو کٹ بھی جائے تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ خیر سے وہ تہذیبی قوت تو ہمارے پاس رہی نہیں جو modern Condition Post کے انہدام کے لیے ضروری ہے، لہٰذا نظری، منطقی اور جمالیاتی نظریہ سازی شاید ہمیں اس کی زد میں پوری طرح آنے سے روک سکے۔

یہ جو کہتے ہیں کہ انسانی شعور میں کسی مستقل ادراک پر رہنے کی صلاحیت یا خاصیت یا میلان نہیں پایا جاتا، اس کو رد کرنے کے لیے صرف اتنی بات ہی کافی ہو سکتی ہے کہ خود یہ اصول بھی انسانی شعور ہی کا Reflection ہے۔ یہ دعویٰ بھی انسانی شعور کی مستقل قبولیت کی صلاحیت پر دلالت کر رہا ہے۔ اپنے بارے میں شعور کا یہ فیصلہ کہ میں متغیر ہوں اور کسی ایک بات پر قایم نہیں رہ سکتا، خود شعوری کی اٹل بنیاد پر ہی تو ہے! اس میں جو گہرا مسئلہ ہے وہ خود شعوری ہے۔۔۔ شعور کی خود شعوری۔۔۔ اس سے خود یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ شعور کسی مستقل دعوے یا کسی absolute notion of knowledge کی قابلیت اور استعداد رکھتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جا سکتا

ہے کہ شعور کے مستقل مسلمات چاہے صورتاً سلبی ہوں، ماہیت میں ایجابی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایجابی ماہیت کے بغیر شعور کسی اصول کو contain کر ہی نہیں سکتا۔ پوسٹ ماڈرنسٹوں کی غلطی یا شرارت یہ ہے کہ انھوں نے شعور کی واقعی فعلیت کو اس تصور کے تابع کر دیا جو یہ شعور کے بارے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کہنا بڑی حد تک درست ہو گا کہ Enlighenment Project یعنی جدیدیت نے جس طرح abstract کو concrete بنایا، مابعد جدیدیت اس رویے کو منقلب کر کے concrete کو abstract بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ چیز چونکہ تصورات کی منطق سے نسبت رکھنے کی بجائے اخلاقی آزادی کی تمنا سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس میں سے کلّیت اور دوام کا عنصر تکلف کے ساتھ خارج کر دیا گیا ہے۔ انسانی شعور کی خلقی اور فطری فعلیت کو حسبِ دلخواہ تجرید کے عمل میں صرف ہوتے ہوئے دکھانے کا بنیادی مقصد محض اتنا نہیں ہے کہ واقعیت کو تصور کے دیرینہ غلبے سے نکالا جائے۔۔۔ اس کا آخری ہدف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعور میں راسخ مذہبی تناظر کو ختم کر دیا جائے اور اس شعور کی بلاواسطہ یا بالواسطہ اثراندازی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تہذیبی اور نفسیاتی اقدار کو بھی زندگی کے تمام دائروں سے نکال باہر کیا جائے۔ مابعد جدیدیت پر فلسفیانہ یا جمالیاتی تنقید کارگر نہیں ہو سکتی کیونکہ فلسفیانہ اور جمالیاتی تصورات کی تشکیل قریب قریب پوری طرح لفظ اساس ہو چکی ہے، یعنی اب تصور و تخیل کی ساری کارکردگی بس یہ رہ گئی ہے کہ لفظ میں موجود یا لفظ

میں ممکن معنوی ساختوں کو زیادہ سے زیادہ اعجوبگی سے برآمد کر دکھایا جائے اور شعور انسانی کی تمام ”عادات“ کو اس عمل کے زور سے توڑ دیا جائے۔

سامنے کی بات ہے کہ ہر تحریر کا ایک اُسلوب بھی ہوتا ہے جو مصنف کے فرق کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اگر تحریر آپ اپنی محرر ہے تو اُسلوب کو کس کے کھاتے میں ڈالا جائے گا؟ اسٹائل مصنف کے وجود پر گواہی دیتا ہے نہ کہ تحریر کے وجود پر۔ بظاہر یہ اعتراض فنی اور جمالیاتی ہے لیکن مابعد جدیدیت اس اعتراض کی دھار کند کر کے اسے اپنا بنا لینے کی پوری مہارت اور گنجائش رکھتی ہے۔ اس لیے اس اعتراض کو شعور کی غیر جمالیاتی قوتوں کو بھی یکجا کر کے اٹھانا چاہیے جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ آدمی کا جمالیاتی موقف بھی شعور کے غیر جمالیاتی مطالبات کو نظرانداز کر کے تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ مصنف یا منشائے متکلم بالکل غیر اہم چیز ہو تو ہماری اجتماعیت کی آخری بنیاد بھی گر جائے گی کیونکہ ہمیں باہم متعلق رکھنے والی کوئی بھی چیز موجود نہیں رہ جائے گی۔

یہی حال Meta Narrative کے انکار کا ہے۔ کچھ دیر پہلے تذکرہ آچکا ہے کہ موجودہ مغرب نے دراصل نٹشے کے غیر متوازن دماغ سے جنم لیا ہے۔ واقعی اتنا اثر انداز ہونے والا آدمی تاریخ فکر میں پیدا نہیں ہوا۔ Meta Narrative کے انکار کا تمام

ترزورنٹشے ہی نے فراہم کیا ہے۔اس نے جب خدا کی موت کا اعلان کیا تو دراصل وہ اعلان Meta Narrative کی موت کا تھا۔ نطشے کی بات تو خیر ایک مجذوبانہ اور خطیبانہ تحکم کی بنیاد پر ایک خاص قسم کی تاثیر اور معنویت رکھتی ہے لیکن پوسٹ ماڈرنسٹوں نے اسے جس طرح ایک ذہنی یا منطقی مسلمے کے طور پر پیش کیا ہے، وہ مضحکہ خیز ہے۔اصولی بات تو یہ ہے کہ Meta Narrative کے انکار کی زد میں ہر Narrative کو آنا چاہیے کیونکہ اگر ایک چیز سادہ واقعاتی سطح پر اپنا وجود ثابت کر دے تو اس کی qualified existence چاہے رد بھی ہو جائے تو بھی اس چیز کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔خود Narrative کو ماننا اس بات کا ثبوت ہے کہ Meta Narrative کی موجودگی ناگزیز ہے۔اس کی اصالت میں تعطل آجانے سے شعور کی تمام سرگرمیاں باہم مربوط نہیں رہیں گی اور ایک انتشار کا شکار ہو جائیں گی۔

پھر پوسٹ ماڈرنسٹوں کا یہ اصرار کہ لفظ اور شے میں یا لفظ اور اس کے معنی میں کوئی ذاتی رشتہ نہیں ہے۔یعنی ''معنی'' لفظ کی essential property نہیں ہے۔ معنی تو ہم دیتے ہیں۔اس پر ایک اعتراض یہ ہے کہ معنی دینے کا عمل بھی لفظ ہی کرتے ہیں کیونکہ انسان کوئی ایسی بات نہیں سوچ سکتا جو لفظ میں نہ ہو۔ ہمارے اندر کوئی ایسا احساس اور خیال موجود نہیں جو ملفوظ نہ ہو۔ لفظوں کو معنی بھی وہی دیے جاتے ہیں جو لفظ میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں، ملکات کی طرح۔۔۔ لفظ میں معانی واقعات کی طرح بھی ہوتے ہیں

اور ملکات کی طرح بھی۔۔۔ ہمارا انسانی شعور ابھی اتنا پختہ نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان کو تجزیے کی اس سطح تک لے جا سکیں۔ ہمارے یہاں تھیوری کے نام پر جو کچھ موجود ہے اسی سے ظاہر ہے کہ ہم بڑے مسائل اور معاملات میں صرف شامل باجا کا کردار ادا کر سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ بہر حال پوسٹ ماڈرنزم مکمل انارکی ہے۔ کاش ہم دیکھ سکتے کہ یہ انارکی ہم پر کن پہلوئوں سے اثر انداز ہو سکتی ہے اور ہماری کن قدروں کو متاثر کر سکتی ہے۔